ببول

افسانوں کا مجموعہ

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

تنویر اختر رومانی

نام کتاب	:	ببول (افسانوں کا مجموعہ)
مصنف	:	تنویر اختر رومانی (08092792511)
پتا	:	۵۹، چوناشاہ کالونی، آزادنگر (مانگو)، جمشید پور۔۸۳۲۱۱۰ (جھارکھنڈ)
مرتّب	:	سعید فردوسی (09431523558)
تعدادِ اشاعت	:	۳۰۰
سن اشاعت	:	۲۰۱۶ء
ضخامت	:	۱۴۴ر صفحات
قیمت	:	۲۰۰ر روپئے
ناشر	:	عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

BABOOL
(A short stories collection)
by:
Tanweer Akhtar Roomani
Year of Publication : 2016
Price : Rs. 200/-

انتساب

اپنے دیرینہ رفیق، افسانہ نگار

ڈاکٹر آفاق اختر

کے نام

جس کے اخلاص اور غمگساری نے

میرے قلبِ بریدہ کو

بڑا حوصلہ عطا کیا ہے

''انسان کے کچھ اعمال کی سزا خدا دنیا ہی میں دے دیتا ہے۔ یہ اس کا قانون ہے اور ہم اس کے قانون میں کیا دخل دے سکتے ہیں۔''

(افسانہ ''ببول'' سے)

مشمولات

افسانے

عرضِ مرتب

سب جانتے اور مانتے ہیں کہ کہانی کا تعلق کہنے اور سننے سے ہے، لکھنے اور پڑھنے سے ہے، کہانی کار اور قاری کے مابین ترسیل سے ہے۔ کہانی کار کی منشا کی قاری تک رسائی سے ہے۔ اگر یہ رسائی بہ آسانی اور سیدھے سیدھے انجام پذیر ہو جائے تو فبہا۔ وگرنہ تھوڑی بہت ذہنی کسرت کے بعد تو اسے پایۂ تکمیل تک پہنچ ہی جانا چاہئے۔ ایسا نہیں ہوتا ہے تو........ کہانی کار کو قاری بیزاری، قاری کو اپنی سمجھ کا شاکی اور خود کہانی کو معمگی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

مذکورہ ان ہی ماپ ڈنڈوں کا استعمال کر کے میں نے تنویر اختر رومانی کے افسانوں کا انتخاب اور ان کی ترتیب عمل میں لائی ہے۔

''بول'' اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کھولئے، جو مل جائے پڑھ لیجئے، پھر کہئے! لگے گا نہیں آپ کو کہ یہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے!! اس میں شامل بیشتر افسانے ہندو پاک کے معتبر رسائل و جرائد کی زینت بن چکے ہیں اور قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

آئیں، آپ بھی قارئین کی اس بھیڑ میں شامل ہو جائیں تا کہ میں تنویر اختر رومانی کے دوسرے مجموعے کے افسانوں کے انتخاب و ترتیب میں سرگرم ہو جاؤں۔ بس اتنا ہی!

سعید فردوسی

جمشید پور

۲۸/اپریل ۲۰۱۶ء

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

زندگی کی سچائیوں کو افسانہ کرنے والا فن کار

جمشید پور میں ادب کی روایت تقریباً صد سالہ سفر طے کر چکی ہے۔ شاعری اور افسانہ نگاری، دونوں کے بڑے بڑے فن کار جمشید پور نے دیے ہیں۔ بات جب شہر آہن میں افسانے کی ہو تو زکی انور، ہربنس سنگھ دوست، منظر کاظمی، گربچن سنگھ، عبدالرزاق کھڑگ پوری، شمیم چاروی، حسن نظامی کیراپی کی نسل کے بعد انور امام، رضا احمد ادیب، حیدر راحت، جی ڈی، احمر، اسلم ملک، تنویر اختر رومانی کی نسل سامنے آتی ہے۔ تنویر اختر رومانی اس نسل کی اپنی مثال خود کہے جا سکتے ہیں۔ ۱۹۷۵ء سے اپنا افسانوی سفر شروع کرنے والے تنویر اختر رومانی کا، چالیس سال کے طویل عرصے میں، پہلا مجموعہ ''بول'' منظر عام پر آ رہا ہے۔ مجموعے کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر کے متعدد اسباب ہیں۔ سب سے بڑا سبب تو افسانہ نگاری میں تسلسل کا فقدان ہی ہے۔ کبھی خوب افسانے لکھے اور کبھی طویل مدت تک حقیقت سے صرف آنکھیں چار کرتے رہے۔

تنویر اختر رومانی کا شمار مشترکہ بہار کے زود گو قلم کاروں کی صف اول میں ہونا چاہئے۔ جی ہاں، اس قلم کار نے درجنوں طبع زاد افسانے تحریر کیے، درجنوں کہانیوں کا اردو سے ہندی میں ترجمہ اور ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا، شاعری کی، مضامین لکھے، تنقید، تحقیق، تدوین، تالیف کی، بچوں کے لیے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی لکھا، صحافت میں بھی قلم کے جوہر دکھائے۔ ان میں سے زیادہ تر کام یافت کے لیے کیا۔ ایسے رسائل و جرائد میں شائع ہونے کا نشانہ مقرر کیا جو معاوضہ دیا کرتے تھے۔ جب تخلیق کار کا مقصد ایک سے زائد ہو تو بہت کچھ ادبی نہیں ہوتا۔ تنویر اختر رومانی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بقول کرشن بہاری نور لکھنوی ؎

اتنے حصے میں بٹ گیا ہوں
اپنے حصے میں کچھ بچا ہی نہیں

تنویر اختر ایک زمانے میں اردو اور ہندی کے پہلے درجے کے کم، دوسرے درجے کے زیادہ تر رسائل میں تواتر کے ساتھ نظر آتے تھے۔ کہیں نظم، کسی میں ترجمہ شدہ افسانہ، کسی میں مضمون، کسی میں بچوں کی کہانی تو کہیں طبع زاد افسانہ اور کہیں افسانچے۔ الغرض ہر طرف تنویر اختر رومانی کا نام چھایا ہوا تھا۔ ایسے میں افسانہ نگار تنویر اختر رومانی کو تلاش کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ افسانوں کی تعداد بتدریج کم ہوتے ہوتے تقریباً صفر ہو گئی اور ایک طویل عرصہ ایسا گزرا کہ کوئی افسانہ منصۂ شہود پر نہیں آیا۔

تنویر اختر رومانی کی ذاتی زندگی بھی اندھیرے اور روشنی کے درمیان آنکھ مچولی کے مصداق رہی ہے۔ فن کار کی زندگی دو سطحوں پر گزرتی ہے۔ ایک اس کی ادبی دنیا اور دوسری اس کی روزمرہ کی زندگی۔ میں نے بڑے بڑے فن کاروں کی روزمرہ اور ذاتی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے قول (تحریر) اور فعل (اعمال و افعال) میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اپنی تحریروں میں اخلاقیات کا استعمال کرنے والے بعض فن کار ذاتی زندگی میں بڑے بد اخلاق ہوتے ہیں۔ تنویر اختر رومانی کے یہاں تضاد نہیں ملتا۔ ان کا صاف و شفاف کردار ان کی کہانیوں میں بھی ویسا ہی نظر آتا ہے۔ مجھے تسلیم کہ تنویر اختر رومانی نے بہت زمانے تک افسانے نہیں لکھے۔ کوئی معرکۃ الآرا

افسانہ تخلیق نہیں کیا۔ افسانے کی دنیا میں اپنی مستحکم شناخت قائم نہیں کی۔ لیکن انہوں نے زندگی میں اپنی ذمہ داریوں سے منہ نہیں موڑا۔ تیرگی میں بھی امید کی کرن کو زندہ رکھا۔ بینائی سے محروم کئی اولادوں کی پرورش و پرداخت میں کمی نہیں آنے دی۔ بے شمار راتیں ان کی بے خوابی کی شاہد ہیں۔ زندگی سے مردآہن کی طرح آنکھیں ملانا سب سے بڑا فن ہے اور تنویر اختر رومانی نے ایسے فن کو برتا ہے۔ برسوں وہ حقیقت کو افسانہ اور افسانے کو حقیقت سے روشناس کراتے رہے۔ کبھی اپنے کردار پر حرف نہیں آنے دیا۔ نئی نسل کی تعلیم و تربیت، ادب کی خدمت اور آپسی میل جول اور بھائی چارے کے فروغ میں اپنا صدفی صد وقت دینے والے ایک عظیم انسان، ایک فن کار کا نام تنویر اختر رومانی ہے۔

تنویر اختر رومانی ادبی خدمات کے لیے بھی ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ رسالوں کی گھر گھر تقسیم ہو، ادبی انجمنوں کا قیام ہو یا جلسوں کا انتظام و انصرام۔ محفلوں کی نظامت ہو یا حساب کتاب کرنا، تنویر اختر رومانی ان سب میں باقی ہیں۔ جمشید پور سے میرے تعلق سے تو سبھی لوگ واقف ہیں۔ لیکن یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ میری ادبی اساس کے استحکام میں تنویر اختر رومانی کی رہنمائی بھی شامل رہی ہے۔ میں نے جب سے ادبی زندگی میں قدم رکھا (۱۹۸۱ء) تب سے تنویر اختر رومانی کو جمشید پور کی ادبی فضا کی تعمیر و تشکیل میں آگے آگے دیکھا۔ ادارہ بزم، ادبی چوپال، عبارت (سہ ماہی رسالہ) وغیرہ کے ذریعے نہ صرف جمشید پور میں ادب کی رفتار کو قوت عطا کرتے رہے بلکہ ایک نسل کی تربیت میں بھی مصروف رہے۔ انور امام، رضا احمد ادیب، حیدر راحت، مستفیض انمول (ایم رحمٰن)، سلطان احمد ساحل جیسے ہم عصروں سے ناچیز، اختر آزاد، مہتاب عالم پرویز، اصغر امام اشک جیسے کم عمروں تک کے ساتھ دوستانہ مراسم سے ہر حلقے میں مقبولیت رکھتے ہیں۔

جہاں تک تنویر اختر رومانی کی افسانہ نگاری کا معاملہ ہے تو میں اس سے قبل بھی کہہ چکا ہوں کہ وہ نہ تو پریم چند، نہ منٹو، نہ بیدی، نہ کرشن چندر اور نہ انتظار حسین جیسے افسانہ نگاروں کے نقش قدم پر ہیں اور نہ ہی ان میں سے کسی کی جھلک ان کے یہاں ہے۔ وہ صرف اور صرف تنویر اختر رومانی ہیں۔ ان کا لفظ لفظ ان کا اپنا ہے۔ اپنے رنگ کا اپنا انداز لئے وہ زندگی کی حقیقتوں کو لفظوں کے جامے پہناتے ہیں۔ آج کے زمانے میں ناقدین میں ایک عام سی بیماری لگ گئی ہے کہ وہ کسی بھی افسانہ نگار پر لکھتے وقت اس کی اتنی تعریف کرتے ہیں کہ اس کے افسانوں کو کسی بڑے افسانہ نگار کے ہم پلہ قرار دیتے ہوئے اسے بڑے افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ یہ اندازِ نقد بہتر نہیں۔ ہر فن کار کو اس کی تحریر کی روشنی میں ہی پرکھنا چاہئے۔ بڑے افسانہ نگاروں سے تقابل درست نہیں۔ اس لحاظ سے میں ایماندارانہ طور پر کہہ سکتا ہوں کہ تنویر اختر رومانی بہت بڑے افسانہ نگار قطعی نہیں ہیں۔ نہ ہی ان کے افسانوں میں پریم چند، منٹو، بیدی وغیرہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہاں وہ ایک افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے حقیقت کی سنگلاخ زمینوں پر محنت کے مختلف رنگ کے ثمر ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی، ذاتی غم اور اندوہ لفظوں میں ڈھل کر ایک دوسرے کے بن جاتے ہیں۔ ہر قاری کو وہ اپنا محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے کردار، ان کی زندگی، ہماری زندگی، ہمارے رشتہ دار اور احباب کی زندگی کے کردار ہیں۔ یہ فلمی کردار نہیں ہیں، جو طاقت میں دس دس کے برابر ہوں، نیکی کے مجسمے ہوں۔ یہ گوشت پوست کے انسان ہیں جو شریف ہیں تو ان کے اندر شیطان بھی چھپا ہے جو اعلیٰ کردار کے مالک ہیں تو بدکردار بھی ہیں۔ شر کے نمائندے ہیں تو خیر کے پیامبر بھی ہیں۔ جو محبت کرتے ہیں، وفا میں جان تک نثار کر سکتے ہیں تو دغا بھی دے سکتے ہیں۔ نفرت کا سبب بھی بنتے ہیں۔ یہ سب مل کر تنویر اختر رومانی کے قصوں کو انفرادیت بخشتے ہیں اور کسی بھی افسانہ نگار کے بڑے ہونے کی دلیل اس کی انفرادیت ہے۔

فکشن کے نئے مطالعے سے بعض اہم نتائج سامنے آ رہے ہیں یعنی بڑا اور اچھا

فکشن اپنے گردو پیش کو ضرور پیش کرتا ہے۔ آج کل کے متعدد افسانہ نگاروں کے یہاں سات سمندر پار کے حالات ملیں گے، ایران توران کی باتیں ملیں گی، تصور کی نئی نئی خوبصورت دنیائیں ملیں گی۔ لیکن ان کا اپنا شہر، گاؤں، علاقہ تلاشنے کے بعد بھی نظر نہیں آتا۔ تنویر اختر رومانی کے کئی افسانوں میں جمشید پور سانسیں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ علاقے کا جغرافیہ اور حالاتِ زندگی، جہاں کسی کہانی کو علاقائیت عطا کرتے ہیں تو مصنف کے گہرے مشاہدے کا پتہ بھی دیتے ہیں۔ تنویر اختر رومانی کے بعض افسانے اس اصول پر کھرے اترتے ہیں:

''وہ جب بس سے اترا تو بھوک کی شدت سے اس کے پیٹ میں مروڑ ہو رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چکرا کر گر جائے گا۔ بھوک کی شدت کو کم کرنے کے لیے اس نے آئی ہاسپٹل کے سامنے ٹاٹا کمپنی کے بنائے ہوئے چھوٹے سے پارک میں لگے نل کے پاس پہنچ کر پانی پیا۔''
(بند مٹھی کا کرب)

''صبح جب وہ انٹرویو دینے کے لیے جانے کی تیاری کر رہا تھا تو اس کی ماں نے گڑ کی کالی چائے کے ساتھ دو پتلی پتلی روٹیاں دی تھیں اور کسی پڑوسن سے قرض لے کر دس روپے۔ یہ دس روپے آزاد نگر سے بسٹو پور تک جانے اور وہاں سے آنے کے، بس کرائے کے لیے تھے۔''
(بند مٹھی کا کرب)

''جوبلی پارک بڑی حسین جگہ ہے۔ اتوار کے دن تو پارک کی رونقیں شباب پر ہوتی ہیں۔ شام ہوتے ہی عورتوں، مردوں، بوڑھوں، بچوں کی آمد کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ چند ہی گھنٹوں کے لیے ہی سہی لوگ سب کچھ بھول بھال کر یہاں کی رنگینیوں میں کھو جاتے ہیں۔ دلفریب مناظر، ان میں زندگی کا نیا عزم، نیا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی زینہ دار نہریں اور ان میں بہتے ہوئے پانی کے نیچے رنگ برنگے برقی قمقمے روشن ہو جاتے ہیں۔ نہروں کے بیچوں بیچ چھوٹے چھوٹے چکر دار فوارے جن کی بوچھار میں نوجوان جوڑے اپنے چہروں کو بھگو کر خوب ہنسی ٹھٹھول کرتے ہیں۔ دور دور تک سبزے کی مخمل بچھی ہوئی، انواع واقسام کے پھولوں سے معطر فضا، مختلف درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوائیں اور پارک کی شمالی جانب پرسکون چاندی جیسی جھیل جس میں کنول کے بے شمار پھول اور مرغابیوں کے تیرتے جھنڈ۔ اس جھیل کے ٹھیک وسط میں آسمان سے باتیں کرتا ہوا فوارہ۔ غرض جدھر نظر ڈالئے، آنکھوں کو ٹھنڈک، دل کو فرحت، ذہن کو راحت اور آسودگی کے ہزاروں سامان ہیں جو جوبلی پارک نے اپنے جلو میں جمع کر رکھے ہیں'' (تیسرا طوفان)

''میں نے رانچی سے جمشید پور تک کے سفر کا پورا ماجرا بیان کر دیا۔ سن کر کہنے لگے۔ ''کیا بتاؤں مدنی صاحب... ان حرام خوروں کی وجہ سے اسٹیٹ ٹرانسپورٹ بہت گھاٹے میں چل رہا ہے۔'' (دلیش بھگت)

''میں داورری رولنگ مل میں انجینئر ہوں۔ یتیم و یسیر، نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ اس لیے گھریلو قسم کی فکر و پریشانی سے آزاد تھا۔ شیام سندر مینسن کی تیسری منزل کے فلیٹ میں نمبر گیارہ میں رہائش تھی۔ ابھی کچھ دنوں قبل ہی وہ اسی منزل کے فلیٹ نمبر پندرہ میں کرایہ دار بن کر آئی تھی۔ جمشید پور ایسا شہر ہے جہاں پچھتر فیصد لوگ کرائے کے مکانوں میں ہی رہتے ہیں۔''
(حسین سراب)

ان اقتباسات میں جمشید پور سانسیں لے رہا ہے۔آئی ہاسپٹل، آزادنگر، بسٹو پور، جوبلی پارک وغیرہ شہرآہن کے نشانات ہیں۔رانچی جمشید پور سے ملحق شہر ہے جو آجکل جھارکھنڈ ریاست کی راجدھانی بھی ہے۔

بے روز گاری ہر شہر، ریاست اور پورے ہندوستان کا مسئلہ ہے۔اس مسئلے پر ہمارے اکثر افسانہ نگاروں نے طبع آزمائی کی ہے۔تنویراختر رومانی کے افسانوں میں یہ مسئلہ ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ایک دونہیں کئی افسانے اس مسئلے کو مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں۔بعض افسانوں میں بے روزگار زندگی کا دردوکرب کچھ اس قدر شدید ہے کہ قاری لرز کر رہ جاتا ہے۔زندگی کرنے کے لیے انسان کو نجانے کیا کیا کرنا ہوتا ہے۔انسان کا پیٹ ایک ایسی بھٹّی جسے ہروقت گرم رکھنے کے لیے ایندھن کی ضرورت پڑتی ہے اور اگر ایندھن کا بہتر اور مسلسل انتظام نہ ہو تو پھر کیا کیا ہوتا ہے۔''روٹی مانگتی زندگی'' میں میاں ایک تیز رفتار کار کی ٹکر سے بچتے بچاتے بھی زخمی ہو جاتا ہے۔بھیڑ لگ جاتی ہے۔کار والے کو گھیر لیا جاتا ہے۔بہت کہا سنی کے بعد کار والا ایک ہزار روپے دیتا ہے جسے لے کر بیوی اپنے شوہر کو رکشہ میں لے کر اسپتال چلی جاتی ہے۔اسپتال سے لوٹنے کا منظر جو کہانی کا اختتام بھی ہے، ملاحظہ ہو:

''دن ڈھلتا جا رہا تھا اور رکشہ منزل مقصود کی جانب رواں تھا۔وہ دونوں ایک دوسرے کو بڑی دیر تک خاموشی سے دیکھتے رہے۔پھر عورت ہی گویا ہوئی۔''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''خراب کب تھی؟'' مرد نے دھیمے سے مسکرا کر الٹا سوال کیا۔

''تم بے ہوش ہو گئے تھے۔'' بیوی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا؟'' مرد نے کہا اور ہلکے سے ہنس پڑا۔

''آخر ایسا کب تک چلتا رہے گا؟'' بیوی نے اداس ہو کر پوچھا

''جب تک قسمت میں ایسا لکھا ہوگا۔'' مرد کا جواب تھا۔

''لیکن سنو.... یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے۔عورت نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ اس میں محبت اور اپنائیت بھی شامل تھی۔

''کیوں؟'' مرد کے لہجے میں تعجب تھا۔

''اس لیے کہ اب تک پانچویں بار ایسا ہو چکا ہے۔اگر کسی دن کار کی زد میں آ کر تم سچ مچ.....'' (روٹی مانگتی زندگی)

بے روز گاری کا مارا شخص، زندگی پر کھیل کر بھی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔بے روزگاری کا دوسرا چہرہ ''بند مٹھی کا کرب'' میں ملتا ہے۔اس کہانی میں ایک بے روزگار نوجوان انٹرویو کے لیے جاتا ہے۔ماں پڑوسن سے مانگ کر دس روپے دیتی ہے۔چھ روپے کرائے میں خرچ ہو چکے ہیں، دو روپئے کی مونگ پھلی کھالی ہے۔کچھ پیدل چل کر وہ دو روپے بچا لیتا ہے۔مٹھی میں وہی بچے ہوئے دو روپے کا سکہ ہے۔بھوک اپنا زور دکھا رہی ہے۔سامنے ایک اندھا فقیر بھیک مانگ رہا ہے۔بھوک، فقیر اور سکّے کے درمیان ایک کشاکش ہے۔بالآخر وہ ایک فیصلہ کر کے فقیر کے پاس پہنچتا ہے اور اس کے سامنے پڑے ڈھیر سارے سکوں میں اپنا سکہ ڈال کر ایک سکہ اٹھا لیتا ہے۔قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس نے فقیر پر رحم کھایا اور اپنی بھوک کی قربانی دی ہے۔لیکن کہانی اس وقت نیا موڑ لے لیتی ہے جب وہ ہوٹل میں سموسے کھانے اور چائے پینے کے بعد مٹھی میں بند سکہ ہوٹل کے کاؤنٹر پر دیتا ہے۔وہ سکہ ایک روپے کا نہیں، دس روپے کا ہے۔یہ بے روزگاری کا المیہ ہے جو انسان کو اپنا ضمیر، اپنا ایمان بھی فروخت کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ویسے اس افسانے کا عنوان خیرات یا قربانی ہوتا تو زیادہ مؤثر ہوتا۔

جمشید پور نہ صرف مشترکہ بہار بلکہ ہندوستان کے ایسے شہروں میں شمار ہوتا ہے

جنہیں فسادات کے نقطۂ نظر سے بہت زیادہ حساس مانا جاتا ہے۔اس کا سبب یہاں ہونے والے متعدد فسادات ہیں۔1964ءاور1979ء کے فسادات جمشید پور جیسے خوبصورت شہر کے چہرے پر بدنما داغ کی مانند ہیں۔ان دو فسادات کے علاوہ چھوٹے موٹے فسادات کی ایک طویل فہرست ہے۔1979ء کا فساد رام نومی تہوار کے وقت وقوع پذیر ہوا تھا۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہر سال رام نوی کے موقع پر پورے شہر پر خوف و ہراس کے بادل چھائے رہتے ہیں۔1992ء میں بھی یہاں فضا خراب ہوئی تھی۔جب جب ملک کے دیگر شہروں میں فساد ہوئے ہیں یہاں کی فضا خراب ہوتی رہی ہے۔ایسے میں ایک حساس فن کار کے یہاں ان حالات کی عکاسی ناگزیر ہو جاتی ہے۔تنویر اختر رومانی کے بہت سے افسانوں میں فساد کے بھیانک مناظر، فساد کے بعد کے حالات اور اس کے مضر اثرات کی غمازی ملتی ہے۔'بدولت' ایسی ہی ایک عمدہ کہانی ہے۔اس کہانی میں فساد میں مارے گئے افراد کو ملنے والے معاوضے سے مصنف نے انسانی ذہن کی خباثت کو سامنے لانے کا کام کیا ہے۔شہر میں فساد کے نتائج دیکھیں:

''تین برس قبل جب شہر میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا تو اس کے نتائج نے اس کے خیالات کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔جو لوگ اس فساد میں ہلاک ہوئے تھے ان کے پسماندگان یا اہل خاندان کو ریاستی سرکار کی جانب سے ایک ایک لاکھ روپے کی امداد دی گئی تھی۔مہلوکین میں سے جو لوگ بڑی کمپنیوں میں ملازم تھے ان کی اولاد یا لواحقین میں سے کسی ایک کو ان کی جگہ پر ملازمت دی گئی تھی۔
یہ سہولتیں دیکھ کر اس نے مجھ سے ایک دن کہا تھا'' کاش! میں بھی اس فساد میں مارا گیا ہوتا تو کم سے کم میری موت کی بدولت ہی کچھ رقم میرے باپ کو مل گئی ہوتی۔'' (بدولت)

اور کہانی کے اختتام پر قاری کو ایک زبردست دھچکا لگتا ہے جب اسے علم ہوتا ہے کہ کہانی کے مرکزی کردار نے ادھار کے مانگے دیسی پستول سے فساد میں اپنے دشمن کا کام تمام کر دیا تھا اور اس کا سب سے بڑا دشمن کون تھا؟ وہ اس کے باپ کے سوا کوئی نہیں تھا؟ اور اس کی بدولت اسے اپنے باپ کی جگہ ملازمت مل گئی تھی۔ملاحظہ کریں:

''آخر میں اس سے اتنی نفرت کیوں کرنے لگا تھا۔کیا اس لیے کہ اس نے باپ کی موت کو بھلا دیا تھا؟ کیا اس لیے کہ میرے سمجھانے کے باوجود وہ فساد میں شیطان کا ہم رقص بنا تھا؟ کیا میں اس کی نئی نئی خوشیوں، آسودگیوں سے حسد کرنے لگا تھا؟ نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔نفرت تو اس لیے تھی کہ اس نے ایسی انسانیت سوز حرکت ہی کی تھی۔دنیا جانتی ہے کہ اسے یہ ملازمت فساد میں مارے گئے اس کے باپ کی بدولت ملی ہے۔لیکن اس نے صرف مجھے بتایا تھا کہ یہ ملازمت فساد کے دن مورچہ پر لے گئے اس بھدے سے دیسی پستول سے نکلی گولی کی بدولت ملی ہے۔'' (بدولت)

فساد کی بہترین عکاسی ''جس پہ تکیہ تھا'' میں بھی موجود ہے۔اس کہانی میں فساد میں پولس کے رویے اور کردار پر کاری ضرب ہے۔کہانی کے مرکزی کردار مہندر سنگھ کے گھر پر شر پسند افراد (جو اس کے شناسا ہی ہیں) سامان باندھ رہے ہیں۔وہ جب اعتراض کرتا ہے تو لوگ ہنستے ہیں اور جب وہ پولس میں خبر کرنے کی دھمکی دیتا ہے تو وہ مزید ہنستے ہیں۔کہانی کا اختتام بہت پر اثر اور چونکانے والا ہے:

''کچھ بھی ہو، میں تمہارے خلاف ایف آئی آر ضرور کروں گا۔'' مہندر سنگھ

نے اٹل انداز میں کہا۔ سنتوش چڑانے والے انداز میں بولا'' ہاں ہاں، ضرور جاؤ تھانے......لیکن ایک بات کی جانکاری لے لو۔ شاید تمہارے کام آئے...وہ یہ کہ تمہارا ٹی وی اور فرج ہم لوگوں نے تھانہ کے بڑا بابو کے یہاں ہی پہنچایا ہے... ہاہاہاہاہا..'' (جس پہ تکیہ تھا)

فسادات نے جہاں ہمیں بے شمار نقصانات پہنچائے ہیں وہیں ہماری ذہنیت کو بھی متاثر کیا ہے۔ بعض فتنہ پرور، خودغرض اور حریص قسم کے لوگ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب کبھی انہیں فساد کی شکل میں ایسے مواقع ہاتھ لگتے ہیں، وہ بھی گنگا میں ہاتھ دھو لیتے ہیں اور دُہرے فائدے اٹھاتے ہیں۔ ایک تو اپنا مطلب نکال لیتے ہیں، دوسرے معاوضہ بھی حاصل کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر مذہب، فرقے اور برادری میں ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی مذہب ہوتا ہے نہ رشتہ۔ یہ ایسے مواقع پر سگے رشتوں کا خون تک کر گزرتے ہیں۔

تنویر اختر رومانی کے کئی کردار ایسے ہیں جو بعد میں بھی زندہ رہنے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہ ایسے کردار ہیں جو قاری کے ذہن سے کبھی سوال بن کر اور کبھی زندگی کے فلسفے کی شکل میں چپک جاتے ہیں۔ یہ دور اور دیر تک قاری کو خود میں الجھائے رکھتے ہیں۔ قاری افسانے کی فضا میں گم ہو جاتا۔ تنویر اختر رومانی کے یہاں ایسے کئی افسانے ہیں جن کی اساس کرداروں پر ہے، جو کرداروں کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ ببول، دنگل، بھروسہ، پردھان جی ایسے افسانوں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ افسانے ہیں جن میں تنویر اختر رومانی کی کردار نگاری کے جوہر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ببول کے چاچا رمضانی، دنگل کے ظہور پہلوان، بھروسہ کی ایفا، پردھان جی کے پردھان تنویر اختر رومانی کے ایسے کردار ہیں جو نہ صرف خود زندہ رہیں گے بلکہ اپنے خالق کو بھی زندہ رکھیں گے۔ ان کرداروں میں منفی (چاچا رمضانی، پردھان جی) کردار بھی ہیں۔ چاچا رمضانی، جنہیں ان کے بیٹے نے مار کر گھر سے نکال دیا ہے پہلے تو گاؤں کے بزرگوں اور نوجوانوں کی ہمدردی کا مرکز بن جاتے ہیں لیکن جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ چالیس برس قبل رمضانی نے بھی اپنے والد کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا تو ہمدردی جتانے والے سبھی پڑوسی ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں تو چاچا رمضانی بوڑھے برگد، کنواں اور اپنی تنہائی کے ساتھ اکیلے رہ جاتے ہیں۔ گاؤں کے بزرگ شکور چاچا جب بھیڑ کو حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں تو منظر ہی بدل جاتا ہے:

''رمضانی بھائی.....تم کو یاد ہے نہ وہ چالیس سال پہلے کا واقعہ.... مجھے تو اچھی طرح یاد ہے....ایسا ہی یاد ہے جیسے کل کی بات ہو اور یہاں موجود بہت سے بوڑھوں کو بھی ہوگا.....ایسی ہی ایک جاڑے کی رات تھی.....اور تقریباً یہی وقت تھا...کنویں کے اسی چبوترے پر جہاں تم بیٹھے ہو..... بالکل اسی جگہ تمہارا باپ بیٹھا بلک بلک کر رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا، آج رمضانی نے بہت مارا ہے....'' (ببول)

تنویر اختر رومانی نے رمضانی چاچا کی شکل میں ایک زندہ جاوید کردار تخلیق کیا ہے جو اپنے اعمال کے نتیجے میں برے انجام تک پہنچتا ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو بظاہر منفی لگتا ہے لیکن اپنے عمل کے ذریعے لوگوں کے لیے عبرت کا سبق ثابت ہوتا ہے۔ ایسا ہی کردار پردھان جی کا ہے جو ایک خلیفہ کے غریب پروری کے واقعے سے متاثر ہو کر ہر روز رات کو گاؤں میں اپنے مصاحب کے ساتھ گشت کرتا ہے۔ ایک رات، ایک گھر میں موجود ماں، بیٹی کی آواز اسے روک لیتی ہے۔ وہ دونوں اپنی پریشانی بیان کر رہی تھیں۔ پردھان جی نے ماں کی فوری امداد کے لیے اپنے مصاحب کے ساتھ اپنے آفس بھیج کر، دروازے کی کنڈی اندر سے بند کر لی ہے۔ یہ ایک دورخی کردار ہے۔

بظاہر مثبت نظر آنے والا کردار کہانی کے اختتام پر نئے رنگ کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا کریہہ چہرہ ہے۔ پردھان جی کا یہ کردار قاری کے اندر اتر جاتا ہے اور اس کے ذہن سے چپک جاتا ہے۔

''دنگل'' کا ظہور پہلوان، علاقے کا مشہور پہلوان ہے۔ کبھی کسی مقابلے میں ہارا نہیں ہے۔ گاؤں کے ٹھاکر بھانو پرتاپ اسے بہت مانتے ہیں۔ اس کی سرپرستی کرتے ہیں۔ ایک بڑے مقابلے میں ظہور اپنے سے کمتر پہلوان ہیرا لال اہیر سے ہار جاتا ہے۔ نہ صرف گاؤں کے لوگوں کے جوش وخروش پر پانی پڑ جاتا ہے بلکہ بھانو پرتاپ ظہور کی اس ہار کو ہضم نہیں کر پاتا ہے۔ ایک لاکھ روپے کا مقابلہ ہار جانے سے سبھی ظہور سے مایوس اور ناراض ہیں۔ ٹھاکر بھانو پرتاپ سنگھ ظہور سے ہار کا سبب پوچھتے ہیں تو پتہ لگتا ہے کہ ہیرا لال کو پیسوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ یعنی ظہور جان بوجھ کر ہار جاتا ہے۔ ہار، ہار نہ رہ کر فتح کی شکل میں پھولوں کا ہار بن جاتی ہے۔ انسان دوستی کی ایسی مثال کم کم ملتی ہے۔

'بھروسہ' کی ایفا بھی ایسی ہی بے مثل کردار ہے جو آہستہ آہستہ قاری کے ذہن میں سما جاتی ہے۔ ایفا ایک ذہین بچی ہے۔ اس کی ماں ایک ورکنگ وومین ہے۔ باپ بھی جاب میں ہے۔ ایفا اسکول کے علاوہ گھر پر بوا (کام والی) کے ساتھ رہتی ہے۔ ایفا کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات آتے ہیں۔ وہ کچھ کچھ پریشان رہتی ہے۔ ماں بھی پریشان ہو جاتی ہے۔ بیٹی کی طرف سے اسے بہت فکر لاحق ہوتی ہے۔ شوہر سے مشورہ کر کے ڈاکٹر کو دکھانے کی بات طے ہوتی ہے۔ لیکن ایفا کے ایک سوال نے رضیہ کو متزلزل کر دیا۔ وہ اس سے سوال کرتی ہے کہ کیا آپ اپنے زیورات کے لاکر کی چابی بوا (ملازمہ) کو دے کر آفس جا سکتی ہیں؟ ایفا کے اس سوال پر رضیہ بیٹی کا دماغی خلل سمجھنے لگتی ہے۔ لیکن جب رضیہ اس کو کہتی ہے کہ اپنا قیمتی خزانہ بھی بھلا نوکروں کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ تو ایفا پھر ایک سوال کرتی ہے، تو مما آپ اپنی بیٹی کو کس دل سے بوا کے حوالے کر کے جاتی ہیں؟ یہ ایسا سوال تھا جس نے رضیہ کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی متزلزل کر دیا۔ ایفا اپنے سوالوں کی معصومیت اور سنجیدگی کے ساتھ ایک پختہ کردار کے طور پر ہمارے ذہن ودل پر سوار ہو جاتی ہے:

> ''سوال تھا کہ ایسا لگا جیسے بجلی کا ننگا تار جسم کے کسی حصے سے مس ہو گیا ہو۔ اس سوال پر رضیہ کا پورا وجود لرز کر رہ گیا۔ چائے کی پیالی ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گری اور کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس نے فرطِ جذبات سے بیٹی کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور لرزیدہ آواز میں کہا'' تم نے تو میری آنکھیں کھول دیں...تمہارا مرض پوری طرح میری سمجھ میں آ گیا۔''
> دوسرے دن رضیہ نے مضبوط ارادوں کے ساتھ اپنی ملازمت کا استعفیٰ نامہ بھیج دیا۔'' (بھروسہ)

آج نئی نسل کے افسانہ نگار گاؤں کی طرف کم ہی رخ کرتے ہیں جب کہ آج بھی ہندوستان کے تقریباً ستّر فیصد لوگ گاؤں دیہات میں رہتے ہیں۔ پریم چند، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی، راجند سنگھ بیدی، بلونت سنگھ وغیرہ نے جس طرح اپنے اپنے علاقے کے دیہات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا وہ بعد میں کم ہوتا گیا۔ نئی نسل میں اکا دکا افسانہ نگار ہی دیہات کی بہترین عکاسی کر رہے ہیں۔ تنویر اختر رومانی کے یہاں بھی کم ہی سہی، لیکن دیہات نظر آتا ہے۔ تنویر اختر رومانی آبائی طور پر بنارس کے دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی بعض کہانیوں میں نہ صرف بنارس کے دیہات کی عکاسی ملتی ہے بلکہ پوربی زبان کا استعمال بھی ملتا ہے۔ 'ببول' اور 'دنگل' اس زمرے کی نہ صرف نمائندہ کہانیاں ہیں بلکہ یہ تنویر اختر رومانی کے افسانوی سفر کے سنگِ میل ہیں۔ یہ دونوں کہانیاں تنویر اختر رومانی کی خوبصورت اور معیاری کہانیوں

میں شمار ہوتی ہیں۔ دونوں کہانیوں میں دیہات کے سیدھے سادھے لوگوں کی زندگی
کی عکاسی ہے۔ ببول بونے والے کو پھل کی شکل میں آم نہیں ملا کرتا۔ چاچا رمضانی کو
بیٹے کی شکل میں جو ببول ملے ہیں، وہ دراصل ان کی ہی تخم ریزی ہے۔ کہانی میں
دیہات کا عمدہ بیان ہے۔ 'دنگل' میں بھی بنارس کے دیہات کی سچی تصویر ہمارے
سامنے آتی ہے۔ گاؤں میں جب دنگل ہوتے ہیں تو کیا سماں ہوتا ہے؟ کس طرح فتح
کے جشن منائے جاتے ہیں اور کس طرح لوگ اپنے مفاد کو پس پشت ڈال کر دوسروں
کے کام آتے ہیں۔ دیہات کی سب سے بڑی خوبی لوگوں کا اتحاد ہے جسے فرقہ پرستی کا
کوئی بھی زہر اب تک زہریلا نہیں کر پایا ہے۔ ظہور پہلوان مسلمان ہو کر ایک ضرورت
مند ہیرا لال اہیر کے لیے دنگل میں ہار جاتا ہے۔ تنویر اختر رومانی نے دیہات کو
خوبصورت اور حقیقی شکل میں پیش کیا ہے:

''یہ کنواں پرکھوں کے زمانے کا ہے۔ یہ گاؤں کے کئی واقعات اور حادثات
کا گواہ بنا ہے۔ اس کے چاروں اطراف میں بنا لمبا چوڑا چبوترہ گاؤں
والوں کے بڑا کام آتا ہے۔ گاؤں میں ہونے والے کسی تنازع پر یہ پنچوں کا
منچ بن جاتا ہے۔ الیکشن کے زمانے میں سیاسی جلسوں کے لیے یہ اسٹیج کا
بھی کام کرتا ہے۔ اکثر یہ چوپال کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ موسم گرما
میں، رات کو جب گھروں میں امس زیادہ ہوتی ہے تو بڑے بوڑھے اسی
چبوترے پر شب باشی بھی کر لیتے ہیں۔ اس گاؤں سے گزر کر آگے کسی
گاؤں کو جانے والے راہی اسی چبوترے پر بیٹھ کر پاس کھڑے پرانے نیم
کی گھنی چھاؤں میں کچھ دیر ستا لیتے ہیں۔'' (ببول)

''اکھاڑے کے مشرقی سرے پر پرگاس پور کے تین چار نوجوان پہلوان ہیرا
لال اہیر کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے تھے اور اس گاؤں کے کافی لوگ ان کے
پیچھے کھڑے تھے۔ مغربی جانب ظہور پہلوان اپنے شاگردوں کے ساتھ
تشریف فرما تھے اور ان کی پشت پر تقریباً پورا نیا بازار کھڑا تھا۔ شمال کی
جانب ایک بڑا اسٹیج سجایا گیا تھا جس پر ٹھاکر جی صدر نشیں تھے۔ ساتھ میں
گاؤں کے سرپنچ، مکھیا اور ضلع کے ایس ڈی ایم صاحب ٹھاکر جی کی دعوت پر
مہمان خصوصی کی حیثیت سے براجمان تھے۔'' (دنگل)

ہر افسانہ نگار اپنا اسلوب لے کر آتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلوب
دوسروں سے کس طرح اور کس قدر مختلف ہے۔ اسلوب کی یہی انفرادیت نکھرنے اور
سنورنے کے بعد کسی ادیب، شاعر یا افسانہ نگار کی شناخت بن جاتی ہے اور وہ صاحب
اسلوب کہلاتا ہے۔ یہ مقام بھی بعد میں آتا ہے اور اکثر ادباء و شعراء کی زندگی میں کبھی
نہیں آتا۔ میرا ایسا کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ تنویر اختر رومانی صاحبِ اسلوب افسانہ نگار
ہیں۔ یوں بھی یہ ان کے افسانوی سفر کا پہلا پڑاؤ ہے۔ لیکن تنویر اختر رومانی کی زبان،
ان کی اپنی زبان ہے۔ ان کی اپنی لفظیات ہیں جو انہیں دوسروں سے الگ کرتی ہیں۔
وہ کردار کے مکالمے، اس کی نفسیات، ماحول اور علمی لیاقت کے عین مطابق تحریر کرتے
ہیں۔ تنویر اختر رومانی کے اسلوب کے چند نمونے پیش ہیں:

''چاند ابھی مشرقی افق پر اپنے نمودار ہونے کا عندیہ دے رہا تھا۔ اس لیے
سارے گاؤں میں اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ صرف تاروں کی چھاؤں تھی
جس میں لوگوں کے بس ہیولے نظر آ رہے تھے۔'' (ببول)

''الفاظ تھے کہ درد و یاس میں ڈوبی ہوئی آواز کا ایک طوفان۔ وہاں موجود
سارے لوگوں کے کلیجے دہل گئے۔'' (ببول)

''نہیں استاد، او سرا کا ہمت کیسے ہوا..... ارے کوئی بڑا پہلوان ہوتا تو کونو

بات تھا...تین چار برس سے کشتی لڑ رہا ہے...دو تین دنگل کا مار لیا کہ''

(دنگل)

''ایک مرد کے زمانہ شباب میں کئی خواہشات، کئی آرزوئیں اس کے دل میں کروٹیں لیتی ہیں۔ وہ کتنا ہی بے بس، کتنا ناکارہ اور نا آسودہ حال ہو مگر وہ اپنا وقار قائم رکھنا چاہتا ہے۔ وہ معاشرت میں عزت چاہتا ہے۔''

(حق)

تنویر اختر رومانی کے اس پہلے مجموعے ''ببول'' کو ان کے اب تک کے افسانوی سفر کا انتخاب بھی سمجھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مجموعے میں متعدد خوبصورت، عمدہ اور معیاری کہانیاں ہیں۔ ببول، دنگل، بھروسہ، روٹی مانگتی زندگی، بند مٹھی کا کرب، جس پہ تکیہ تھا، بدولت، چالیسواں سنگِ میل، پردھان جی، بڑے لان والا آدمی، تیسرا طوفان وغیرہ اچھی کہانیوں کے زمرے میں آتی ہیں لیکن جہاں تک نمائندہ اور زندہ رہنے والی کہانیوں کی بات ہے تو دنگل، ببول، بھروسہ، چالیسواں سنگِ میل، پردھان جی، روٹی مانگتی زندگی تنویر اختر رومانی کو استحکام بخشیں گی۔ مجموعے کی کئی کہانیاں اوسط درجے میں رکھے جانے لائق ہیں اور کئی کہانیاں مجھے پسند نہیں آئیں۔ ہوسکتا ہے آپ میری بات سے اتفاق نہ کریں۔

تنویر اختر رومانی کئی دہائیوں تک اپنی تخلیقات سے ادبی دنیا میں جمشید پور کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ ببول کے ساتھ ایک بار پھر منظر عام پر آرہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے دامن میں کانٹے ہی کانٹے ہیں لیکن یہ دیکھنے میں بھی کانٹے ہی ہیں۔ یہ ان پھولوں سے بہتر ہیں جو قریب آنے پر کانٹے کی طرح چبھنے کا کام کرتے ہیں، بلکہ یہ خار ایسے ہیں کہ ان میں انسانوں کا درد ہے، غریبوں کی بے بسی ہے تو نوجوانوں کے حسین خواب بھی ہیں۔ یہ زندگی کے ترجمان ہیں۔ ہوسکتا ہے ان میں سے کوئی خار آپ کی زندگی کا غماز ہو اور پھر خاردار راستے ہی آپ کو گلستاں تک لے جاتے ہیں۔ خدا کرے 'ببول' افسانوی دنیا میں قاری کی حفاظت میں مستعد محافظ ثابت ہو اور پھول کا سا احساس کرائے۔

☆☆☆☆☆

Zindagi ki Sachchaiyon ko Afsana karne wala Fankar: Tanweer Akhtar Roomani

by :
Dr. Aslam Jamshedpuri,
HOD, Urdu,CCS University,
aslamjamshedpuri@gmail.com

کچھ بیاں اپنا

میرے دوافسانوں ''ببول'' (مطبوعہ 'ایوان اردو' ـ نئی دہلی، جولائی ۲۰۱۵) اور ''دنگل'' (مطبوعہ 'آجکل' ـ نئی دہلی، اپریل ۲۰۱۶) میں جس گاؤں کا منظرنامہ ہے، اسی گاؤں میں اس دنیائے فانی میں میری آمد ہوئی۔ الحمدللہ اب تک باقی ہوں۔

زندگی میں ۵۹ر بہاریں دیکھ چکا ہوں، ساٹھویں کی تیاری ہے۔ ۵۹ر بہاریں تو میں نے محاورتاً اور روایتاً لکھ دی ہیں ورنہ نہ جانے کتنی خزاؤں سے بھی سابقہ پڑ چکا ہے۔ اب آگے پتا نہیں بہار ہو کہ خزاں ہو۔

میرا تعلق کسی علمی و ادبی خانوادے سے نہیں ہے۔ علم و ادب تو دور رہا، سات پشتوں میں شاید ہی کوئی میٹرک پاس ہو۔ میں اپنے خاندان میں پہلا پوسٹ گریجویٹ ہوں۔ میرے پاس زبان وادب کی جو تھوڑی بہت اہلیت ہے، اس میں کچھ تو ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کی مرہون منّت ہے اور کچھ ہائی اسکول کے اردو، ہندی، انگریزی کے استاد، ماہرِ فنِ عروض وبلاغت، بلند پایہ شاعر مرحوم عبدالمغنی جوؔہر بلیاوی کی تدریس کا فیض ہے۔

افسانہ کیا ہوتا ہے، یہ میں نہیں جانتا تھا۔ اردو اور ہندی کی نصابی کتابوں میں جو اصلاحی کہانیاں ہوتی تھیں، انہیں بس نصابی ضرورت کے تحت ہی پڑھتا تھا۔ ان سے اکتساب کی صلاحیت نہیں تھی۔ غالبًا ۱۹۷۱ کا زمانہ تھا، جب میں نویں جماعت کا طالب علم تھا، استاد محترم جوؔہر بلیاوی نے نامور افسانہ نگار محمود واجد کے افسانوں کا مجموعہ ''خزاں کے پھول، بہار کے دن'' تفویض کیا۔ یہ پہلی ادبی کتاب تھی جس سے میری واقفیت ہوئی تھی۔ ہاں، اس سے کچھ ہی مدت قبل ماہنامہ ''نور'' (رام پور) اور ماہنامہ ''کھلونا'' (نئی دہلی) کا مطالعہ گاہے گاہے ہوتا تھا، جس سے مطالعے کا شوق پروان چڑھتا گیا۔ ۱۹۷۲ میں ابن صفی کا ایک ناول ''مہلک شناسائی'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ تب میں نے جانا کہ ادب میں ناول بھی کوئی چیز ہے۔ پھر تو جیسے میرے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز مل گیا۔ جنون کی حد تک ابن صفی کا گرویدہ ہوگیا۔ میرے پاس صحت مند زبان بولنے کی جو صلاحیت ہے، یقین جانئے، یہ ابن صفی کے ناولوں کی دین ہے۔ آج بھی بڑے ذوق وشوق سے ان کے ناول پڑھتا ہوں۔ اردو کے بڑے سے بڑے فنکار کی کتاب ہو اور اس کے ساتھ ابن صفی کا کوئی ناول ہو (جسے میں نے کئی بار پڑھ رکھا ہو) تو میں اسے ہی پڑھنے کو ترجیح دوں گا۔

جب کالج پہنچا تو کچھ ادبی اور نیم ادبی رسالوں سے شناسائی ہوئی۔ ابتدا میں تو ''دلگن'' اور ''خاتون مشرق'' جیسے رسالے پڑھتا تھا۔ لیکن جب ''آجکل'' اور ''شاعر'' جیسے رسالوں کا چسکا لگا تو ان رسالوں سے کنارہ کش ہوگیا۔

افسانے، ناول، ڈرامے، تنقید، تحقیق، لسانیات، شاعری پڑھتے پڑھتے محسوس ہوا کہ مجھے بھی لکھنا چاہئے۔ چنانچہ جون ۱۹۷۵ میں ایک افسانہ 'ندامت کے آنسو' لکھا۔ یہ ایک معاشرتی، اصلاحی افسانہ تھا۔ اسے ماہنامہ 'بتول'، رام پور (جس کا اجرا شاید ایک سال قبل ہی ہوا تھا) میں بھیج دیا۔ پہلا ہی افسانہ چھپ گیا۔ اس کامیابی پر جیسے مجھے قارون کا خزانہ مل گیا۔ پھر ایک کہانی بچوں کے لئے لکھی ''بڑوں کا ادب'' جو رام پور کے ہی ماہنامہ ''جنت کا پھول'' میں شائع ہوئی۔ ان کامیابیوں نے میرے اندر

مزید لکھنے کا حوصلہ عطا کیا۔ اور لکھتا گیا، چھپتا گیا۔ اس چھپنے کی دھن میں نہ تو رسالوں کے معیار کا دھیان رکھا نہ افسانوں میں وزن کا۔ بس جو رسالہ نظر آتا اس میں کچھ نہ کچھ چھپنے کا ہدف رکھتا۔ (اب تک اردو اور ہندی کے ایک سو اکتالیس رسالوں، جریدوں اور اخبارات میں چھپ چکا ہوں، لیکن معدودے چند ہی قابلِ ذکر ہیں) جس کی وجہ سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ پانچ درجن سے زاید افسانوں میں محض ۶۔۷ ہی ایسے افسانے ہوئے جنہیں ''بس اچھا'' کہا جا سکتا ہے۔ اس نقصان کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ادب کی سبھی اصناف پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ابن صفی کے لازوال کرداروں، فریدی اور حمید کو لے کر ایک جاسوسی ناول 'جرم کا زینہ' بھی لکھ مارا، جو تا ہنوز منتظرِ اشاعت ہے۔ چونکہ میں کسی ایک صنف کا وفادار نہیں رہا اس لئے کوئی صنف میری نہ ہو سکی۔ اس نقصان کا مجھے شدید احساس ہے۔

۱۹۹۰ سے ۲۰۱۴ تک طبع زاد تخلیقات سے بالکل کنارہ کش رہا۔ اس طویل مدت میں بس تین نظمیں (۱۹۹۰)، تین مضامین (۱۹۹۸) اور دو افسانے (۲۰۰۰) ہی لکھے۔ ہاں، ۱۹۹۰ سے ۱۹۹۷ تک بڑی تندہی اور تواتر سے اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو کہانیوں کا ترجمہ کرتا رہا اور معاوضے کی شکل میں 'کمائی' کرتا رہا۔ ۱۹۹۸ سے ترجمے کے کام کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ کیونکہ ۱۹۹۷ میں جماعت اسلامی ہند سے وابستگی ہوگئی تھی۔ جس کے سبب مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ ۲۰۰۳ میں جماعت کی رکنیت حاصل ہوئی اور ۲۰۱۱۔۱۳ کی دوسالہ میقات میں مقامی امارت کی ذمہ داری بھی سنبھالنا پڑی۔ میری مصروفیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۹۷۵ سے ہی اردو ادب کے فروغ کے لئے پورے شہر میں گھر گھر اردو کے رسالے پہنچاتا تھا۔ جماعت سے وابستگی کے بعد جماعت کے اخبار ''دعوت'' اور رسالہ ''زندگی نو'' وغیرہ بھی خریداروں تک پہنچانے کی ذمہ داری مل گئی تھی۔

والدین نے تو میرا نام تنویر اختر رکھا تھا۔ شمع اور روبی جیسے فلمی/ادبی رسالوں کے مطالعے کے دوران مشہور فلمی مکالمہ نگار ''اختر رومانی'' کے نام سے واقفیت ہوئی تو مجھے ''رومانی'' لفظ بہت پسند آیا۔ میرے نام کے آخر میں ''اختر'' تو تھا ہی۔ سو میں ۱۹۷۵ میں تنویر اختر رومانی ہوگیا۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے نہ تو رومانی افسانے پسند ہیں، نہ ناول، نہ اشعار۔ ''رومانی'' کے مقابلے میں ''جاسوسی'' کو ترجیح دیتا ہوں۔

جمشید پور قلمکاروں اور اردو رسائل کے معاملے میں بڑا زرخیز رہا ہے۔ ہندوستان کے بے شمار رسالے آتے تھے۔ کئی ادبی انجمنیں قائم تھیں۔ ادبی محفلیں بھی خوب سجتی تھیں۔ ہر طرح کے رسالوں کے مطالعے اور ادبی محفلوں میں شرکت نے بھی میرے لکھنے کو جلا بخشی ہے۔ ۱۹۷۸ میں خود بھی، بزرگ افسانہ نگار حسن نظامی کیراپی کی معیت میں، ادارہ 'بزم' قائم کیا جو کئی سال تک متحرک رہا۔ یہ ادارہ، پندرہ روزہ ''بزم'' کی مناسبت سے تھا، جس کے مدیر حسن نظامی کیراپی رہے ہیں۔ ۱۹۸۴ میں (مرحوم) ساغر برنی، انور امام، جہانگیر محمد اور اختر آزاد کے اشتراک سے ایک فعال انجمن ''ادبی چوپال'' کی بنیاد رکھی۔

مدیرانہ صلاحیت نہ ہونے کے باوجود حسن نظامی کیراپی کے تعاون سے اپریل ۲۰۰۰ء میں سہ ماہی ''عبارت'' کا اجرا کیا، جو لگاتار، پابندیِ وقت ساتھ انتیس (۲۹) شمارے نکل کر بند ہوگیا۔

جنوری ۱۹۸۲ سے ۱۹۸۶ تک ملت اردو مڈل اسکول، ذاکر نگر میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

فروری ۱۹۸۳ میں کیبریہ اردو مڈل اسکول تک بحیثیت معاون معلم رسائی ہوئی، جہاں سے ۲۸ر فروری ۲۰۱۷ کو سبکدوشی کا پروانہ مل جائے گا۔

لکھنے کے معاملے میں میرا جو نقصان ہوا تھا، اس کا مجھے شدید احساس تھا۔ اسی

احساس نے میرے خشک ہو چکے ادبی سوتے کو ''جگایا'' اور جولائی ۲۰۱۴ سے ایک بار پھر مجھے قلم اور قرطاس سے مانوس ہونا پڑا۔ یہ میرا دورِ ثانی ہے۔ اس دور میں ساری اصناف سے قطع نظر صرف افسانے اور تنقیدی مضامین لکھنے کا عزم کر رکھا ہے۔ اب تحریر میں وزن اور رسالوں کے معیار بھی مدنظر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی معیاری رسالوں میں میرے افسانے کو جگہ مل رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مجموعے کے افسانے آپ کو پسند آتے ہیں کہ نہیں۔ اصل کسوٹی تو آپ ہی ہیں۔

میرے بارے میں مزید تفصیلات ''مختصر کوائف'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

کیا امید رکھوں کہ ان افسانوں کے تعلق سے آپ ایک فون کر کے یا ایک مختصر خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں گے؟

مختصر کوائف

اصلی نام : تنویر اختر

قلمی نام : تنویر اختر رومانی

تاریخ پیدائش : ۱۰ فروری ۱۹۵۷

جائے پیدائش : نیا بازار، بھدوہی، ضلع: بنارس (اب سنت روی داس نگر)

ابتدائی تعلیم : (الف) مدرسہ اسلامیہ، نیا بازار (درجہ پانچ تک۔ ۱۹۶۶)
(ب) سرکاری مڈل اسکول، نیا بازار (درجہ ششم۔ ۱۹۶۷)
(ج) شری اندر بہادر سنگھ نیشنل انٹر کالج، بھدوہی (درجہ ہفتم۔ ۶۸-۱۹۶۷)

ثانوی تعلیم : (الف) بھالو باسہ نائٹ ہائی اسکول، جمشید پور (درجہ ہشتم۔ ۱۹۶۸)
(ب) کبیر میموریل اردو ہائی اسکول، ذاکر نگر، جمشید پور (درجہ ہشتم سے یازدہم/میٹرک۔ ۱۹۶۹ سے ۱۹۷۳ تک)
(ج) جمشید پور ورکرس کالج، (آئی ایس سی۔ ۱۹۷۸)

اعلیٰ تعلیم : (الف) کریم سٹی کالج، جمشید پور (اردو آنرس۔ ۱۹۸۲)
(ب) کریم کالج آف ایجوکیشن (بی ایڈ۔ ۱۹۸۳)

پہلا افسانہ : ندامت کے آنسو (ماہنامہ بتول۔ رام پور، دسمبر ۱۹۷۵)

اب تک ۱۶۲ افسانے۔

بچوں کی پہلی کہانی : بڑوں کا ادب (ماہنامہ جنّت کا پھول، رام پور، دسمبر ۱۹۷۵)

اب تک ۱۳ کہانیاں۔

پہلا مذہبی مضمون : مومن کا معاشرہ (ہفتہ وار نشیمن۔ بنگلور، ۳۰ رنومبر ۱۹۷۵)

اب تک ۳ مضامین۔

پہلی نظم : آج کا انسان (ماہنامہ نام ونشان۔ بدایوں، جنوری ۱۹۷۶)

اب تک ۱۵ نظمیں۔

پہلا افسانچہ : سسکتی انسانیت (ماہنامہ جان نثار۔ امرت سر، ستمبر ۱۹۷۶)

اب تک ۱۴۱ رافسانچے۔

پہلا ڈرامہ : جے جوان جے کسان (ماہنامہ گلِ نو۔ حیدرآباد، مئی ۱۹۷۸)

اب تک ۲ ڈرامے۔

پہلا انشائیہ : گرم مسالہ (پندرہ روزہ مگدھ پنچ۔ پٹنہ، یکم اپریل ۱۹۷۹)

اب تک ۱۰ رانشائیے۔

اردو سے پہلا ترجمہ : ریکارڈ شیٹ، مصنف: شارق ادیب

(ہندی ماہنامہ نونیت، بمبئی۔ فروری ۱۹۸۰)

اب تک ۱۵ راردو افسانوں کا ترجمہ

ہندی سے پہلا ترجمہ : بجھے ہوئے انگارے، مصنف: علاء الدین آل آزاد

(سہ ماہی زبان وادب، پٹنہ۔ ۱۹۸۱)

اب تک ۱۲ رہندی کہانیوں کا ترجمہ

پہلی غزل : چہرہ چہرہ اترا اترا　　غم کا سایہ ڈیرا ڈیرا

(ماہنامہ سازِ سرمدی، دہرہ دون۔ اپریل ۱۹۸۲)

اب تک ۱۴ رغزلیں

پہلا تحقیقی مضمون : اردو پر دوسری زبانوں کے اثرات

(سہ ماہی زبان وادب، پٹنہ۔ جنوری تا مارچ ۱۹۸۲)

اب تک ۲ رمضامین

پہلا تبصرہ : دوہانجلی (شاد باگل کوٹی کے دوہوں کا مجموعہ)

(پندرہ روزہ آغازِ کاروبار، جمشید پور۔ ۱۶ راکتوبر ۱۹۹۸)

اب تک ۵ رتبصرے

پہلا تنقیدی مضمون : لیمی نیٹیڈ گرل (ڈاکٹر اختر آزاد کا ناول): ایک جائزہ

(سہ ماہی امید سحر، رانچی۔ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴)

اب تک ۵ رمضامین

ان کے علاوہ بے شمار افسانچوں، نظموں، بچوں کی کہانیوں کے اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو میں ترجمے کیے۔

کچھ قابلِ ذکر رسالے جن میں میری تخلیقات شائع ہو چکی ہیں:

(۱) آجکل، نئی دہلی (۲) ادب لطیف، کراچی (۳) انشا، کلکتہ (۴) ایوان اردو، نئی دہلی
(۵) بانو، نئی دہلی (۶) تعمیر ہریانہ، چنڈی گڑھ (۷) پاسبان، چنڈی گڑھ
(۸) رابطہ، کراچی (۹) رفیق منزل، نئی دہلی (۱۰) زبان وادب، پٹنہ
(۱۱) شمع، نئی دہلی (۱۲) کہکشاں، بمبئی

بچوں کے رسالے:

(۱) امنگ، نئی دہلی (۲) بچوں کی دنیا، نئی دہلی (۳) کھلونا، نئی دہلی (۴) نور، رام پور

☆☆☆☆☆

ببول

دفعتاً رونے کی آواز سن کر محلے کے لوگ چونک پڑے۔

اس آواز میں بڑا درد تھا، بڑی مظلومیت تھی۔لگتا تھا کوئی ضعیف شخص اپنی بے بسی اورلاچاری پرزاروقطار رورہا ہے۔

وہ کون شخص ہوگا جو اتنی رات گئے محلے والوں کے دلوں کو بے چین کئے دے رہا ہے۔لحاف وکمبل سے نکلنا لوگوں کوگراں گزر رہا تھالیکن یہ گاؤں کی روایت کے خلاف تھا کہ کوئی فریاد کرے اور گاؤں والے نظرانداز کردیں۔

چاندابھی مشرقی افق پہ اپنے نمودار ہونے کا عندیہ دے رہا تھااس لئے سارے گاؤں میں اندھیرے کی حکمرانی تھی۔صرف تاروں کی چھاؤں تھی جس میں لوگوں کے بس ہیولے نظر آرہے تھے۔

رونے کی آواز گاؤں کے سب سے پرانے کنویں کی طرف سے آرہی تھی۔آس پاس کے دروازے کھلنے لگے۔دریافت حال کے لئے محلے کے کئی افراد اس کنویں کے قریب پہنچ گئے۔ان میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی۔عورتیں اپنے اپنے دروازوں پرکھڑی تجسس بھری نگاہوں سے جائے واقعہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

یہ کنواں پُرکھوں کے زمانے کا ہے۔یہ گاؤں کے کئی واقعات وحادثات کا گواہ ہے۔اس کی چاروں اطراف میں بنا لمبا چوڑا چبوترہ گاؤں والوں کے بڑے کام آتا ہے۔گاؤں میں ہونے والے کسی تنازع پر یہ پنچوں کا منچ بن جاتا ہے۔الیکشن کے زمانے میں سیاسی جلسوں کے لئے یہ اسٹیج کا بھی کام کرتا ہے۔اکثر یہ چوپال کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔موسمِ گرما میں،رات کو جب گھروں میں امس زیادہ ہوتی تو بڑے بوڑھے اسی چبوترے پر شب باشی بھی کر لیتے ہیں۔اس گاؤں سے گزر کرآگے کسی گاؤں کو جانے والے راہی اسی چبوترے پر بیٹھ کر، پاس کھڑے پرانے نیم کی گھنی چھاؤں میں کچھ دیر ستا لیتے ہیں۔

کنویں کے پاس کھڑے نیم کے تناور درخت کے سبب کنویں کے آس پاس گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

آنے والوں میں دوتین لوگوں کے ہاتھوں میں لالٹینیں تھیں،ایک دو شخص کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں جن کی روشنیاں اندھیرے کو شکست دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔دوچار نوجوان یہ کام اپنے موبائیل فون میں لگی چھوٹی سی ٹارچ سے لے رہے تھے۔

کنویں کے قریب پہنچ کرلوگوں نے دیکھا کہ اس کے چبوترے پرکوئی بوڑھا شخص اس کی جگت سے ٹیک لگائے بیٹھا رو رہا تھا۔

''ارے کون ہے بھائی....کیوں رورہے ہیں؟'' کسی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

ان ہمدردانہ سوالوں اور وہاں جمع بھیڑ میں ہورہی چہ میگوئیوں کی آواز سن کر بوڑھے نے سر اٹھا کرلوگوں کی طرف بے کسی سے دیکھا اور...اور بلک بلک کر رونے لگا۔کچھ بول نہیں پایا۔

اس کے سر اٹھانے پر کسی نے پہچان لیا۔''ارے یہ تو رمضانی چاچا ہیں۔''

دوسرے نوجوان نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔''کیا ہوا رمضانی چاچا؟''

لیکن رمضانی چاچا کچھ نہیں بولے۔بس روتے ہی رہے۔ایسا لگتا تھا کہ وہ رونے پر قابو نہیں پا رہے تھے۔کچھ بولنے کے لئے زبان کھولتے کہ اندر سے ایک درد بھری لہر اٹھتی اور رونے میں تیزی آجاتی۔

''خدانہ کرے کیا کسی کی.....؟ سوال ادھورا چھوڑ دیا گیا۔سب لوگ سمجھتے تھے کہ

یہ کیا سوال ہے؟ ادھورے سوال میں آگے کون سے الفاظ ہوں گے۔ لیکن ان الفاظ کو ادا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

''نہیں!'' رمضانی چاچا کی زبان سے بس اتنا ہی نکلا۔

''پھر کیا بات ہے.... اتنا بلک بلک کر کیوں رو رہے ہو؟'' اس بار ایک عمر دراز شخص نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ہم عمر ہونے کی بے تکلفی بھی تھی اور غمگساری کی جھلک بھی۔

اس سوال پر رمضانی چاچا جیسے پھٹ پڑے۔ ''یا اللہ مجھے موت دے دے.... یہ دن دیکھنے کو میں زندہ رہا۔''

الفاظ تھے کہ درد و یاس میں ڈوبی ہوئی آواز کا ایک طوفان۔ وہاں موجود سارے لوگوں کے کلیجے دہل گئے۔

ضرور کوئی انہونی ہوئی ہے۔ ورنہ رمضانی چاچا اس طرح کیوں بلکتے؟ وہ عورتوں سے بھی زیادہ کلپ رہے تھے۔

پھر وہاں موجود لوگ آپس میں ہی اٹکل لگانے لگے۔ سب اپنے اپنے ڈھنگ سے قیاس کرنے لگے۔ لیکن ہر کوئی اپنے قیاس پر مطمئن نہیں تھا۔

''چپ ہو جا رمضانی.... چپ ہو جا.... اور بتا کیا بات ہے؟'' ایک بوڑھے شخص نے ان کے کاندھے کو تھپتھپا کر دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ اس دلاسے پر اب رمضانی چاچا صرف سسکیاں لینے لگے۔

''کیا معاملہ ہے بھئی؟'' اچانک ایک پاٹ دار آواز نے سب کو چونکا دیا۔ لوگوں نے آواز کی طرف سر گھما کر دیکھا گاؤں کے شکور چاچا بھیڑ میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لوگوں نے انھیں راستہ دے دیا۔ وہ کنویں کے چبوترے پر بیٹھے رو رہے شخص کی طرف غور سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کسی نے لالٹین اٹھا کر اس کی روشنی رمضانی چاچا کے چہرے کی طرف کی۔

کسی نوجوان نے بتایا۔ ''رمضانی چاچا ہیں.... بہت پوچھنے پر بھی کچھ نہیں بتا رہے ہیں۔''

''اچھا!...'' کہہ کر وہ رمضانی چاچا کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ ٹھنڈ کی وجہ سے رمضانی چاچا کے تھرتھراتے اور کانپتے جسم کو دیکھ کر شکور چاچا نے بھیڑ میں اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا۔ ''منیر، جادوڑ کر گھر سے پہلے ایک کمبل لے آ۔''

فوراً ہی کمبل آ گیا۔ شکور چاچا نے انہیں اپنے قریب بلایا۔ رمضانی چاچا کھسک کر چبوترے کے کنارے آ گئے۔ پھر شکور چاچا نے اپنے ہاتھوں سے کمبل کو اچھی طرح ان کے جسم کے گرد لپیٹ دیا۔ پھر پوچھا ''کیا بات ہے رمضانی بھائی؟''

''رمضانی بھائی'' کے اپنائیت بھرے فقرے سے جیسے رکے ہوئے آنسوؤں کا باندھ ٹوٹ گیا۔ بلبلا کر بولے۔ ''آج رجوا نے بہت مارا ہے؟''

''رجوا؟'' شکور چاچا نے حیرت سے پوچھا۔ ''تمھارا بیٹا؟''

''ہاں!''

سبھی کے دماغ گھوم گئے۔ اتنا بڑا انّیائے؟ اس بڑھاپے میں یہ درگت...! ضعیفوں کے چہروں پر اندیشوں کی کئی پرچھائیاں آ کر گزر گئیں۔ کیا اب گاؤں میں بھی بوڑھوں کا گھر (Old Age Home) بنے گا؟ وہ لوگ متوحش نظروں سے نوجوانوں کی طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے بچے بھی یہ سلوک ان کے ساتھ کرنے لگیں۔

رمضانی چاچا یہی کوئی ستّر برس کے ہوں گے۔ شکور چاچا کے ہم عمر۔ ان سے دو چار مہینے چھوٹے ہوں تو ہوں۔ ان کی کل چار اولادیں تھیں۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں۔ دونوں بیٹیاں بیاہ دی گئی تھیں۔ بڑا بیٹا جوانی میں داغِ مفارقت دے گیا تھا۔ اب ان کے گھر میں کل پانچ پرانی تھے۔ دونوں بوڑھے بوڑھی، چھوٹا بیٹا راجو، اس کی بیوی اور ان کا پوتا۔

یوں تو آئے دن رمضانی چاچا کے گھر میں چپقلش ہوتی رہتی تھی۔ کبھی باپ بیٹے میں، کبھی ساس بہو میں۔ ریاض احمد عرف رجوا ذرا تیز مزاج کا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بیوی کی طرفداری میں والدین سے الجھ پڑتا تھا۔ وہ ماں باپ کو ہمیشہ بوجھ سمجھتا تھا۔ لیکن ایسا بھی کیا کہ باپ پر ہاتھ چھوڑنے کا گناہِ عظیم کر بیٹھے۔ ان ہی کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے اور ان ہی کو گھر بدر کر دیا ہے۔ نزدیک کے شہر کی بڑی کمپنی میں Employee's son scheme کے تحت ہی اسے ملازمت ملی ہے۔ رمضانی چاچا چاہتے تو یہ نوکری اپنے داماد کو دلا دیتے۔ لیکن اولاد کا حق مارنا انھیں مناسب نہیں لگا تھا۔ حالانکہ وہ شروع سے جانتے تھے کہ رجوا وفادار نہیں نکلے گا۔

کچھ نوجوان تو اتنے طیش میں آ گئے تھے کہ اسی وقت چل کر رجوا کو "سمجھا" دینا چاہتے تھے۔

کسی نوجوان نے کہا۔ "شکور چاچا... آپ ہی جا کر رجوا کو سمجھائیے.... ایسی غلطی نہ کرے.... باپ ہیں.... بوڑھے ہیں.... باپ پر ہاتھ اٹھانا تو بہت بڑا گناہ ہے....."

"تمہارا کہنا صحیح ہے بیٹے... لیکن کہیں ببول کے پیڑ پر بھی پھل لگتا ہے... اس وقت تو سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا... ابھی وہ غصے میں ہوگا... ہوسکتا ہے الٹا وہ ہماری بےعزتی کر بیٹھے...."

شکور چاچا کافی سمجھدار شخص ہیں۔ گاؤں میں ضرور رہتے ہیں لیکن انہیں دنیا کا بڑا تجربہ ہے۔ شہر کی ایک بڑی کمپنی میں انھوں نے پینتیس برسوں تک ملازمت کی ہے، رمضانی چاچا کے ساتھ ساتھ۔ اکثر تو وہ دونوں ایک ساتھ ڈیوٹی کے لئے گاؤں سے نکلتے تھے۔

"کیا ہوا تھا رمضانی بھائی؟" انھوں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ وہ ہمیشہ رمضانی چاچا کو 'رمضانی بھائی' ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

"کچھ نہیں بھیّا۔" رمضانی چاچا کا رونا بہت حد تک کم ہوگیا تھا۔ "کوئی خاص بات نہیں تھی.... آج بہو نے کھانے میں صرف دو روٹی دی تھی... میں نے کہا ایک اور دے دو.... بس لگی بکنے جھکنے... بیٹھے بیٹھے کھا رہے ہو... کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا.... میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ گالیاں بکنے لگی... میں نے بہو کو ڈانٹا تو رجوا اس کی طرفداری میں مجھ سے الجھ پڑا... نشے میں جو بکنا تھا بکا.... اور تو اور.... مجھے کئی تھپڑ مارے اور دھکیل کر گھر سے باہر نکال دیا... اور....."

اس سے آگے وہ بول نہ سکے، بلک بلک کر پھر رونے لگے۔

یہ تفصیل سن کر بہتوں کے خون گرم ہو گئے لیکن کیا کر سکتے تھے۔

"بہت افسوس ہوا... رجوا نے یہ اچھا نہیں کیا... لیکن صبر کرو رمضانی بھائی... اللہ دیکھ رہا ہے... آج نہیں تو چالیس سال بعد اس کا بیٹا تمہارا بدلہ ضرور لے گا۔" شکور چاچا کی آواز فضا میں گونجی۔ عجیب لہجہ تھا ان کا۔ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہمدردی جتا رہے ہیں یا طنز کر رہے ہیں یا تمسخر۔

ایں! .... چالیس سال بعد .... شکور چاچا کیا کہہ رہے ہیں؟.... سٹھیا گئے ہیں کیا؟.... ارے مسئلہ ابھی کا ہے .... رمضانی چاچا چالیس سال تک اسی کنویں کے چبوترے پر بیٹھے انتظار کرتے رہیں گے کیا؟.... شکور چاچا تو بڑے معاملہ فہم آدمی سمجھے جاتے ہیں.... یہ بےتکی بات ان کی زبان سے کیسے نکل گئی؟

"کیا کہہ رہے ہیں چاچا؟.... چالیس سال بعد کیا ہوگا کون جانے.... پتا نہیں رمضانی چاچا زندہ بھی رہیں گے یا نہیں...." کسی نوجوان نے ذرا طیش میں آ کر کہا۔

"کون زندہ رہے گا کون چلا جائے گا اس کا تو علم صرف اللہ کو ہے بیٹے۔" شکور چاچا بڑی نرمی سے بولے۔ "ہم نے دیکھا ہے... اور تم لوگوں نے بھی دیکھا ہوگا .... جوان بیٹے کا جنازہ بوڑھے باپ کے کندھوں نے اٹھایا ہے۔"

ہاں واقعی، یہ بات تو چاچا ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ تو آفاقی حقیقت ہے۔ یہ بات مجھے نہیں کہنا چاہئے تھی.... اس بات کی زد تو شکور چاچا پر بھی پڑتی ہے... شکور چاچا تو گاؤں

میں برگد کی چھاؤں جیسے ہیں....اگر وہ دنیا سے چلے گئے تو گاؤں تو جیسے یتیم ہو جائے گا...ان کی موجودگی میں گاؤں کے لوگ کتنی طمانیت محسوس کرتے ہیں...وہی تو ایک ہیں جو گاؤں والوں کے دکھ سکھ میں بہت اخلاص اور اپنائیت سے شریک ہوتے ہیں...

''معاف کیجئے گا چاچا...غلطی سے یہ بات زبان سے نکل گئی...لیکن چاچا....یہ مسئلہ تو ابھی کا ہے۔''اس نوجوان نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔اس کے لہجے میں ندامت تھی۔

''بیٹا یہ مسئلہ صرف آج کا ہی نہیں ہے....یہ مسئلہ چالیس سال بعد کا بھی ہے..اسی طرح کا ایک مسئلہ چالیس سال پہلے بھی تھا....''

''ہم لوگ آپ کی بات نہیں سمجھ پا رہے ہیں چاچا۔''

''تم لوگ ابھی نہیں سمجھو گے....چالیس سال بعد شاید تم سمجھ جاؤ..'' شکور چاچا اتنا کہہ کر رمضانی چاچا سے مخاطب ہوئے۔''رمضانی بھائی....تم کو یاد ہے نہ وہ چالیس سال پہلے کا واقعہ....مجھے تو اچھی طرح یاد ہے...ایسا ہی یاد ہے جیسے کل کی بات ہو....اور یہاں موجود بہت سے بوڑھوں کو بھی ہو گا....ایسی ہی ایک جاڑے کی رات تھی....اور تقریباً یہی وقت تھا....کنویں کے اسی چبوترے پر جہاں تم بیٹھے ہو.....بالکل اسی جگہ تمہارا باپ بیٹھا بلک بلک کر رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا...آج رمضانی نے بہت مارا ہے....''

سسکتے سسکتے رمضانی چاچا اچانک خاموش ہو گئے۔

تھوڑے توقف کے بعد شکور چاچا کہنے لگے۔''انسان کے کچھ اعمال کی سزا خدا دنیا ہی میں دے دیتا ہے...یہ اس کا قانون ہے اور ہم اس کے قانون میں کیا دخل دے سکتے ہیں؟''

اتنا کہہ کر وہ مڑے اور اپنے گھر کی طرف چل دئے۔

لالٹینوں کے ساتھ اٹھے ہوئے ہاتھ نیچے جھک گئے۔ٹارچوں اور موبائیل فونوں کی روشنیاں بجھ گئیں۔

چاند نمودار ہو چکا تھا۔اچانک ہی لوگوں کو احساس ہوا کہ ٹھنڈک مزید بڑھ گئی ہے۔تب گھروں کے دروازے بند ہونے لگے۔

تھوڑی ہی دیر میں رمضانی چاچا وہاں تنہا رہ گئے۔لیکن نہیں، وہ تنہا نہیں تھے۔ان کے پاس تھا اس حادثے کا گواہ وہ بوڑھا کنواں اور ساتھ میں تھیں چالیس پہلے کی یادیں اور ان کی سسکیاں۔

☆☆☆☆☆

بھروسہ

دن بھر کے سفر کے بعد سورج کی حدّت اور توانائی کمزور ہوگئی تھی۔

ڈیوٹی سے واپس آ کر رضیہ نے اپنی اسکوٹر کو پارکنگ شیڈ کی متعینہ جگہ پر کھڑا کیا اور کندھے سے لٹکے بیگ کو سنبھالتی اپنے فلیٹ تک پہنچی تو یہ دیکھ کر تھوڑی حیرت زدہ اور تھوڑی اندیشے کی شکار ہوگئی کہ اس کی گیارہ سالہ بیٹی ایفا اپنے فلیٹ کے زینوں پر پیر لٹکائے اکیلی، خاموش اور اداس بیٹھی ہے۔

یہ بات معمول سے ہٹ کر تھی۔ اس وقت وہ یا تو ٹی وی پر کارٹون فلم دیکھتی رہتی ہے یا کمپیوٹر پر گیم سے دل بہلاتی رہتی ہے یا کبھی کبھار کالونی کے بچوں کیساتھ کالونی کے پارک میں کھیلتی رہتی ہے۔

اس نے ایفا کے نزدیک پہنچ کر اس کے سر پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے بیٹی؟...... بہت اداس لگ رہی ہو..... کیا بوا نے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں ممّا۔''

''پھر؟..... آج اسکول میں ٹیچر سے ڈانٹ پڑی ہے کیا؟''

''نہیں تو!''

''پھر کیا بات ہے؟''

دونوں باتیں کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

''ممّا..... آج نہ جانے کیوں بہت اداس رہنے کو جی چاہ رہا ہے...... بہت اکیلے پن کا احساس ہو رہا ہے۔'' ایفا نے بڑی معصومیت سے کہا۔

آہ بیٹی! اکیلے پن کا احساس تمہیں آج ہو رہا ہے.... مجھے تو ایک مدت سے یہ احساس ستا رہا ہے.... کتنی اکیلی محسوس کرتی ہوں.... حالانکہ اچھی زندگی جینے کے لئے سب کچھ ہے.... ہر طرح کی آسودگی ہے.... چاہنے والا شوہر ہے.... تم پیاری سی بیٹی ہو.... اچھی اور باعزت ملازمت ہے.... وہ سب کچھ میسر ہے جو ایک خوشحال گھر کو چاہئے.... لیکن وہ کون سی کمی ہے جس کی وجہ سے اکثر تنہائی کا احساس ہوتا ہے.... اور کبھی کبھی بہت شدید ہوتا ہے.... آج جبکہ تم نے اپنی تنہائی کا ذکر کیا تو میری اپنی تنہائی کا احساس شدید ہو گیا ہے کہ میں بھی تمہاری طرح اکیلی ہوں.... میں اکیلی کیوں ہوں.... اداس کیوں رہتی ہوں؟.... حالانکہ تم میرے پاس ہو، میرے ساتھ ہو.... شاید اس کا سبب یہی ہو کہ تمہارا بھائی، میرے جگر کا ٹکڑا اچانک ہی ہمیں چھوڑ کر چلا گیا.... اس کی نا وقت موت کا غم میرے پورے وجود میں سرایت کر گیا ہے.... میں کتنی اداس رہتی ہوں تم سے کہہ نہیں سکتی.... کہہ بھی نہیں سکتی کیونکہ تم میری اداسی، میرے غم، میری تنہائی کو بانٹ نہیں سکتی ہو.... اپنا غم بتا کر تمہیں اور اداس نہیں کر سکتی.....

سوچتے سوچتے رضیہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔

''کیا بات ہے ممّا.... آپ رو رہی ہیں.... میری بات سے تکلیف پہنچی ہے کیا؟''

''نہیں بیٹی.... عطش یاد آ گیا تھا۔'' اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''ساری ممّا.... میں نے آپ کو دکھی کر دیا۔''

ماں کے آنسو دیکھ کر اور اپنے چھوٹے بھائی عطش کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔

عطش ایفا سے چار سال چھوٹا تھا۔ دونوں ساتھ ہی اسکول جاتے اور ساتھ ہی آتے تھے۔ دونوں ایک ہی انگریزی میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دوسال قبل، جس آٹو رکشا سے دونوں بھائی بہن آتے جاتے تھے، اس کا ایک تیز رفتار کار سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں آٹو میں سوار دو بچوں کی جائے حادثہ پر

ہی موت ہوگئی تھی۔ ان میں ایک عطش بھی تھا۔ ایفا اور دوسرے بچوں کو شدید چوٹ پہنچی تھی۔ اس دن کو یاد کر کے ایفا کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اور تب ہی سے رضیہ کی زندگی میں اداسیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ گرچہ دو سال گزر جانے پر اس کی موت کا غم بہت حد تک کم ہو گیا تھا لیکن اداسی کا ایک ہلکا پرتو ہمہ وقت اس کے وجود پر چھایا رہتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اب وہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہوگئی تھی۔ عطش کی پیدائش بڑے آپریشن سے ہوئی تھی۔ اس کی پیدائش کے دو مہینے بعد اچانک پیٹ میں درد اٹھنے لگا۔ کافی دوا علاج کے باوجود درد میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر کار ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سی ٹی اسکین کرایا گیا تو پتا چلا کہ رحم میں زخم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کی رائے تھی کہ رحم کو نکال دینا بہتر ہے ورنہ وہ زخم کینسر میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ اس لئے آپریشن کر کے رحم کو نکال دیا گیا تھا۔ گویا قدرت نے خود ہی اس کی فیملی پلاننگ کر دی تھی۔

اس کی اداسی کو دیکھ کر اس کے شوہر خورشید نے ایک دو بار سمجھایا بھی تھا کہ کوئی نوزائیدہ لڑکا گود لے لو۔ لیکن رضیہ نے یہ گوارا نہیں کیا۔ بے اولاد رہتی تو شاید یہ ممکن تھا۔ اپنی کوکھ کے بچے کی بات ہی کچھ اور ہے۔

اس رات رضیہ کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔

دوسرے دن حسب معمول رضیہ نے ناشتہ تیار کیا، ناشتہ کیا، اپنا اور ایفا کا لنچ باکس تیار کیا اور ساڑھے نو بجے آفس جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ جانے سے قبل حسب معمول بوا کو گھر کی دیکھ ریکھ ہوشیاری سے کرنے اور ایفا کو وقت پر اسکول جانے کی تاکید کی۔

ایفا کے اسکول کا وقت دن کے گیارہ بجے تھا۔ وہ روزانہ ساڑھے دس بجے اسکول کے لئے تیار ہو جاتی کیونکہ اسی وقت آٹو والا آ جاتا۔ چار بجے شام کو اسکول سے واپس آ جاتی۔ جب تک رضیہ یا خورشید گھر نہ آ جاتے، وہ بوا کی نگرانی میں رہتی۔ اس طرح گویا وہ صبح ایک گھنٹہ اور شام کو دو گھنٹے بوا کی دیکھ ریکھ میں رہتی۔ اتوار کے علاوہ دیگر چھٹیوں کے دن تو وہ دن بھر بوا کی نگرانی میں رہتی۔

دوسری شام بھی، آفس سے واپسی پر، جب رضیہ نے ایفا کو پچھلے دن کی طرح گھر کے باہری زینوں پر اداس بیٹھی دیکھا تو اسے لگا کہ ایفا کے دماغ میں ضرور کوئی خلل واقع ہو گیا ہے۔ ورنہ روز روز اس طرح اداس اور گم صم بیٹھی رہنے کا کیا مطلب؟

اسکوٹر کھڑی کر کے اس نے لپک کر ایفا کو اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے بڑے مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔ ’’اب آج کیا ہوا؟‘‘

’’کچھ نہیں ممّا.... بس یوں ہی....‘‘

’’بس یوں ہی؟.... بس یوں ہی کوئی روز روز اداس رہتا ہے.... ضرور کوئی بات ہے.... مجھے بتاؤ.... اپنی اداسی کو میرے ساتھ شیئر کرو۔‘‘

باتیں کرتے کرتے دونوں کمرے میں پہنچ گئیں۔

’’آپ سے کچھ پوچھنا ہے ممّا.... کچھ سوال کئی دنوں سے میرے ذہن میں ہیں... آپ سے پوچھنا چاہتی تھی لیکن ہمت نہیں پڑ رہی تھی....‘‘

’’مجھ سے پوچھنے کے لئے بھلا ہمت کی کیا بات ہے.... بے جھجک پوچھو۔‘‘

’’پوچھوں؟‘‘

’’ہاں بھئی.... پوچھو، پوچھو۔‘‘ رضیہ نے بیٹی کی ہمت بندھائی۔

’’پاپا کی تنخواہ کتنی ہوگی؟‘‘ لہجے میں معصومیت بھری اداسی تھی۔

’’بس یہی سوال پوچھنے کے لئے تم جھجک رہی تھیں؟‘‘

’’سوال تو کئی ایک ہیں ممّا لیکن پہلا سوال یہی ہے۔‘‘ ایفا کے لہجے میں اب بھی اداسی تھی۔

’’یہی کوئی اسّی ہزار۔‘‘

’’اور آپ کی؟‘‘

’’میری تو تیس ہزار ہے.... لیکن بیٹی، ہم لوگوں کی تنخواہ سے تمہیں کیا لینا دینا؟‘‘

ایفا نے ماں کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اگلا سوال کیا۔ ’’آپ کی اور پاپا کی تنخواہ میں اتنا فرق کیوں ہے؟‘‘

’’بھئی وہ ایک بڑی کمپنی میں پرچیزنگ آفیسر ہیں....اور میں ایک چھوٹے سے فرم میں اسسٹنٹ ہوں۔‘‘

’’اچھا ممّا....ہمارے گھر کے اخراجات ایک مہینے میں کتنے ہوتے ہوں گے؟‘‘

’’یہی کوئی پچیس تیس ہزار....بھئی آج تو تم عجیب عجیب سوال کر رہی ہو....آخر یہ سب تم کیوں جاننا چاہتی ہو؟‘‘

’’تو گویا صرف پاپا کی تنخواہ سے ہمارے گھر کے اخراجات اطمینان سے پورے ہو سکتے ہیں....کسی طرح کی تنگی نہیں ہوگی....اگر آپ نوکری نہ کریں تب بھی کسی طرح کی مالی پریشانی نہیں ہوگی....بوا کو بھی رکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی....اس کے بھی پیسے بچیں گے...‘‘

ایفا کی اس بات پر رضیہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک انجان سا اندیشہ سر اٹھانے لگا۔ ’’کیا بوا سے تم کو کوئی شکایت ہے؟....اس نے تمہارے ساتھ کوئی حرکت تو نہیں کی؟‘‘

’’مجھے اس سے کوئی شکایت ہو یا نہ ہو....مجھے تو....مجھے تو....آپ سے شکایت ہے۔‘‘ اس کی آواز بھرا گئی۔ لگا کہ اب رو دے گی کہ تب۔

رضیہ نے کھینچ کر بیٹی کو سینے سے لگا لیا اور کہا۔ ’’تمہاری شکایت درست ہے....لیکن بیٹی، یہ سب ہم دونوں تمہارے لئے ہی تو کر رہے ہیں....تمہارے مستقبل کے لئے ہم دونوں نے کئی سپنے سجا رکھے ہیں۔‘‘

’’میرے بارے میں آپ اور پاپا کیا سپنے دیکھتے ہیں؟‘‘

’’ارے بھئی ....تمہیں اچھی تعلیم دلانا ہے ....آگے چل کر تمہیں ڈاکٹر بنانا ہے....تمہاری شادی کرنا ہے....اس سے پہلے اپنا ایک فلیٹ خریدنا ہے....تم تو جانتی ہو کہ یہ فلیٹ کرائے کا ہے....‘‘

’’ان سپنوں کو پورے کرنے کے لئے کتنے پیسوں کی ضرورت پڑے گی؟‘‘

’’بھئی یہ نیند کے سپنے تو ہیں نہیں کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں....یہ جاگتی آنکھوں کے سپنے ہیں....یہ دل و دماغ کے سپنے ہیں....ان کو حقیقت میں بدلنے کے لئے بڑی رقم کی ضروت پڑے گی۔‘‘

’’اتنے بڑے بڑے سپنے آپ لوگ کیوں دیکھ رہے ہیں کہ بڑی دولت کی ضرورت پڑے....؟‘‘

’’تم ابھی نہیں سمجھو گی....تم ابھی ساتویں کلاس میں ہو ....جب بورڈ پاس کر جاؤ گی تو تمہیں اس کی ضرورت کا احساس ہوگا۔‘‘ رضیہ نے ہنس کر اس کے گالوں کو تھپتھپایا۔ ’’جاؤ، بوا سے کہو چائے وائے لا کر دے۔‘‘

رضیہ نے بیٹی کو تو سمجھا دیا لیکن بیٹی کے چہرے سے صاف جھلک رہا تھا کہ وہ ماں کے جواب سے مطمئن نہیں ہے۔ رضیہ کو یقین ہو گیا کہ بیٹی ضرور کسی دماغی خلل میں مبتلا ہے۔ کوئی نفسیاتی گرہ ہے جس کے نتیجے میں وہ اس طرح کے سوالات کر رہی ہے۔

اس رات اس نے خورشید کو ساری بات بتا کر اس مسئلے پر تبادلہ خیال کرنا چاہا تو خورشید نے کہا۔ ’’ایک دو دن اور دیکھ لیتے ہیں....اگر یہی صورتحال رہی تو پھر کسی سائیکریاٹسٹ کو دکھاتے ہیں۔‘‘

اس رات بھی فکر مندی میں رضیہ گئی رات تک جاگتی رہی۔

پھر تو جیسے ایفا کا یہ معمول بن گیا۔ اگلی شام کو بھی جب رضیہ نے ایفا کو مکان کے زینوں پر اداس اور گم صم بیٹھے دیکھا تو اسے پختہ یقین ہو گیا کہ اسے کوئی ذہنی مرض لاحق ہے۔

اس نے ایفا کے پاس پہنچ کر اس کے سر کو پیار سے سہلایا اور کہا۔ ’’آج تم پھر اداس ہو بیٹی....تم اپنی اداسی کی وجہ بھی نہیں بتاتی ہو....‘‘

''مجھے خود نہیں معلوم ممّا تو میں آپ کیا بتاؤں۔''
''اچھا...آج پھر کوئی سوال ہے کیا تمہارے دل میں؟''
''ہاں ممّا، آج تو بہت اہم سوال ہے۔''
''بھئی تم اپنے سوالوں سے خود بھی پریشان ہوا اور مجھے بھی پریشان کر رہی ہو....معلوم ہے تمہارے سوالوں کی وجہ سے میں دو راتوں سے ٹھیک سے سو نہیں پا رہی ہوں...آج دن بھر سر درد سے پریشان رہی۔''
''بس ممّا آج آخری بار....آج کے بعد پھر کبھی آپ سے ایسے سوال نہیں کروں گی....آپ کو پریشان نہیں کروں گی۔''
''پوچھو....پوچھو....پہلے چائے وائے تو پلوا دو...''
''میں بوا کو بول کر آتی ہوں۔''
تھوڑی دیر بعد بوا نے چائے کے ساتھ کچھ نمکین لا کر رضیہ کے بیڈروم میں میز پر رکھ دئے۔
نمکین کے ساتھ چائے کی چسکی لیتے ہوئے رضیہ نے کہا۔''ہاں، اب بتاؤ اپنے سوال...''
''ممّا، آپ کان میں صرف ایک بالی ہی پہن کر آفس جاتی ہیں....باقی زیورات کیوں نہیں پہن کر جاتیں؟''
''عجیب سوال ہے تمہارا....آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے بیٹی....روزانہ ایسے ایسے سوال کر رہی ہو....بھلا میرے زیورات نہیں پہننے پر تمہیں کیا پریشانی ہے؟....ویسے بھی زیورات روز روز نہیں پہنے جاتے....شادی بیاہ یا کسی پارٹی وارٹی کے لئے پہنے جاتے ہیں۔''
''تو سارے زیورات کہاں رکھتی ہیں؟''
''الماری کے اندرونی لاکر میں۔''

''لاکر اور الماری کی چابی کہاں رکھتی ہیں؟''
''اپنے بیگ میں....اپنے ساتھ آفس لے جاتی ہوں۔''
رضیہ بڑے دھیرج اور خندہ جبینی سے اس کے سوالوں کے جواب دیتی جا رہی تھی۔اسے خدشہ تھا کہ اگر اس کے سوالوں پر ذرا بھی جھنجھلائے گی تو کہیں اس کے ذہن پر منفی اثر نہ پڑ جائے۔
ایفا کا اگلا سوال تھا۔''اگر چابی گم ہو جائے تو؟''
''کیسے گم ہو جائے گی....اسے میں حفاظت سے اپنے بیگ میں رکھتی ہوں۔''
''بیگ تو گم ہو سکتا ہے....کہیں چھوٹ سکتا ہے....کوئی چور اچکّا چھین کر بھاک سکتا ہے۔''
''ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا ہے....اگر کبھی ایسا ہوا تو دوسری چابی بنوانے میں تھوڑی پریشانی ہوگی۔''
پریشانی ہوگی نہ ممّا....اگر آپ چابی کو یہیں گھر پر رکھ جائیں یا بوا کے حوالے کر جائیں تو یہ پریشانی شاید نہ ہو۔''
ایفا لاکھ ذہین سہی لیکن ابھی اتنی بھی نہیں کہ اسے معاشرت کا تجربہ ہو۔
''تمہارا یہ سوال بھی بہت عجیب ہے....بھلا کوئی ایسا کرتا ہے....الماری میں قیمتی زیورات کے ساتھ کافی پیسے بھی رہتے ہیں....نوکرانی چاہے کتنی ہی ایماندار کیوں نہ ہو مگر ان سب معاملات میں اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔''
''ممّا، آپ کے زیورات مجھ سے بھی زیادہ قیمتی ہوں گے۔''
''کیسی بات کرتی ہو بیٹی؟....تم تو ہماری زندگی ہو....یہ سب کچھ تو تمہارے لئے ہی ہیں....بھلا یہ زیورات اور پیسے تم سے زیادہ قیمتی کیسے ہو سکتے ہیں؟''
''تو پھر ممّا، میرے بارے میں بوا پر کیسے بھروسہ کر کے اس کے حوالے کر جاتی ہیں؟''

سوال تھا کہ ایسا لگا جیسے بجلی کا ننگا تار جسم کے کسی حصے سے مس ہو گیا ہو۔ اس سوال پر رضیہ کا پورا وجود لرز کر رہ گیا۔ چائے کی پیالی ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گری اور کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔

اس نے فرطِ جذبات سے بیٹی کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''تم نے تو میری آنکھیں کھول دیں....تمہارا مرض پوری طرح میری سمجھ میں آ گیا...''

دوسرے دن رضیہ نے مضبوط ارادوں کے ساتھ اپنی ملازمت کا استعفیٰ نامہ بھیج دیا۔

☆☆☆☆☆

دنگل

دنگل کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا۔

ضلع کے دنگل پریمی بڑی بے صبری سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے۔

نیا بازار گاؤں کے رئیس ٹھاکر بھانو پرتاپ سنگھ نے اس بار ظہور پہلوان سے مقابلے کے لئے ایک لاکھ روپئے کا اعلان کر دیا تھا اور پورے ضلع میں بڑے پیمانے پر اس کی تشہیر کی تھی۔

ساٹھ سالہ ٹھاکر بھانو پرتاپ سنگھ زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ زمینداری تو ختم ہو گئی تھی لیکن ان کے ٹھاٹ باٹ اب بھی زمیندارانہ ہی تھے۔ کیونکہ وہ گاؤں کے اکلوتے کروڑ پتی تھے۔ ان کے اینٹ کے دو بھٹے اور قالین کا ایک بڑا کارخانہ تھا۔ گاؤں کے چھور پر آم کے کئی باغ تھے۔ بیسوں ایکڑ زراعتی زمین تھی جس سے ہر سال سینکڑوں ٹن اناج پیدا ہوتا تھا۔

اتنے دولتمند ہونے کے باوجود نہایت منکسر المزاج اور بردبار شخص تھے۔ گاؤں میں کیا ہندو کیا مسلمان، کیا سورن کیا دلت سبھی کی نگاہوں میں وہ قابلِ احترام تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے کہ انھوں نے گاؤں میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ایک مثال قائم کر رکھی تھی۔ گاؤں کی ترقی کے لئے ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ ہر فرد کے دکھ سکھ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے گاؤں والوں کو کبھی اس کا احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ایک دولتمند، رئیس اور سوریہ ونشی چھتری ہیں۔

استاد ظہور پہلوان حالانکہ ان سے دس سال چھوٹے تھے لیکن وہ استاد کے ساتھ

بڑی محبت اور احترام سے پیش آتے تھے کیونکہ استاد گاؤں کی عزت اور وقار تھے۔ وہ سارے گاؤں کی آنکھوں کا تارا تھے۔

ظہور پہلوان کا اپنا ایک اکھاڑہ تھا جہاں دس بارہ پہلوان ان سے کشتی کے داؤ پیچ سیکھتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ہندو، مسلمان چھتری، دلت ہر فرقے کے پہلوان تھے۔ ان کا یہ اکھاڑہ ٹھاکر بھانو پرتاپ سنگھ کی سرپرستی میں ہی چلتا تھا۔ اکھاڑے کے سارے اخراجات کا بار ٹھاکر جی ہی اٹھاتے تھے۔ انھوں نے استاد کا ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کر رکھا تھا۔

ظہور پہلوان پندرہ برس سے کشتی لڑ رہے تھے۔ وہ اپنے گاؤں اور ضلعے کے دوسرے دنگلوں میں پچاسوں بار حصہ لے چکے تھے لیکن آج تک انھوں نے شکست کا منھ نہیں دیکھا تھا۔

یوں تو ہر سال ساون کے مہینے میں ضلعے کے کئی گاؤوں میں جگہ جگہ دنگل ہوتے تھے لیکن نیا بازار گاؤں کے دنگل کی بات ہی کچھ اور ہوتی تھی۔ کیونکہ اس دنگل میں ایک تو کشتی کے کئی مقابلے ہوتے تھے، دوسرے یہ کہ کشتی جیتنے والوں کو ایک بڑی رقم بطور انعام ٹھاکر بھانو پرتاپ سنگھ خود اپنے پاس سے دیتے تھے۔ ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس گاؤں کے دنگل میں ظہور پہلوان کی کشتی لڑنے کا انداز دنگل پریمیوں کو لبھاتا تھا ۔ وہ نئے نئے داؤ پیچ سے مقابل کو پل بھر میں شکست دے دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے دنگلوں کی بہ نسبت نیا بازار کے دنگل میں کافی بھیڑ ہوا کرتی تھی۔

دنگل میں دوسرے پہلوانوں کے لئے انعامی رقم دس ہزار روپئے فی کس ہوتی تھی جبکہ ظہور پہلوان کے مقابلے کے لئے بیس ہزار روپئے۔ لیکن اس بار ظہور پہلوان سے مقابلے کے لئے ٹھاکر جی نے اکٹھے ایک لاکھ روپئے کے انعام کا اعلان کر دیا تھا۔

ابھی کچھ دنوں قبل استاد کی اکلوتی بیٹی کی منگنی تھی تو ٹھاکر جی بہ نفس نفیس منگنی کی رسم میں شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے خود استاد کی بیٹی شادی کی تاریخ آنے والی عید کے چاند کی چودھویں کو مقرر کی تھی۔ استاد کو ٹھاکر جی اتنے عزیز تھے کہ انھوں نے ذرا بھی پریشانی کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اتنی جلدی پیسوں کا انتظام کہاں سے ہوگا۔ لیکن ٹھاکر جی ان کی پریشانی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ منگنی کی رسم ختم ہونے پر گھر جاتے وقت انھوں نے کہا تھا۔ ''استاد، صالحہ اس بھانو پرتاپ کی بھی بیٹی ہے، چنتا مت کیجئے گا۔''

اور اس کے ایک ہفتے کے بعد ہی ٹھاکر جی نے اگلے ماہ ہونے والے دنگل میں استاد کے مقابلے پر ایک لاکھ روپئے کا انعام رکھ دیا اور پورے ضلعے میں اس کی تشہیر کرا دی۔

دیواری اشتہار کے چوتھے دن ہی ظہور پہلوان سے مقابلے کے لئے اس بار پرگاس پور کے ہیرالال اہیر نے ٹھاکر جی کے پاس اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

ہفتے بھر بعد کثیر تعداد میں ایک دوسرا پوسٹر پھر پورے ضلعے میں خاص خاص جگہوں پر چسپاں کیا گیا جس میں دونوں پہلوانوں کی تصاویر اور مقابلے کی تاریخ چھپی تھی۔

جس دن دیواروں پر اشتہار لگائے گئے اسی شام استاد ظہور اپنی بکھری (وہ کچا مکان جس کے باہری حصہ میں لمبا دالان ہوتا ہے) کے باہر کھاٹ پر بیٹھے اپنے سات آٹھ شاگردوں سے مصروف گفتگو تھے۔

''استاد، ای سالا اہیرا کو کا سوجھا کہ آپ سے مکابلا کرے۔'' جھمرو پاسی نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

''ارے بھئی، کوئی تو مقابلے پر آئے گا ہی تبھی تو کشتی ہوگی۔'' استاد مسکرا کر بولے۔ ''میرے مقابلے پر ہر سال دو چار لوگ تو آتے ہی ہیں۔'' چونکہ استاد تھوڑے تعلیم یافتہ تھے اس لئے ان کے لہجے میں متانت اور شائستگی تھی۔ روایتی پہلوانوں جیسا اکھڑ پن نہیں تھا۔

''کا سمجھا ہے سالا، استاد کو چت کر دے گا۔'' استاد کے منھ لگے جمن پہلوان نے منھ بچکایا۔

''کیوں تم لوگ اپنا خون جلا رہے ہو؟''

''نہیں استاد، اوسرا کا ہمت کیسے ہوا.....ارے کوئی بڑا پہلوان ہوتا تو کونو بات تھا.....تین چار برس سے کستی لڑ رہا ہے.....دو تین دنگل کا مار لیا کہ.....''

''ہمت کا بات نہیں سبراتی بھائی.....'' پھلگو یادو نے شبراتی کی بات بیچ میں ہی کاٹ کر کہا۔ یہ پھلگو یادو، ہیرالال اہیر کا دور کا رشتہ دار تھا اور اکثر پرگاس پور جایا کرتا تھا۔ ''ہم بتاتے ہیں.....اصل بات ای ہے استاد کہ اس کا بیٹی کا دو ماہ بعد سگائی ہے اور لڑکا والن تلک میں ایک لاکھ روپیا کا مانگ کئے ہیں.....اے ہی واسطے اس نے.....''

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ٹھاکر بھانو پرتاپ سنگھ واکنگ اسٹک ٹیکتے پہنچ گئے۔ استاد جلدی سے کھاٹ پر سے اتر کر کھڑے ہو گئے۔ سارے چیلے بھی احتراماً کھڑے ہو گئے۔

استاد نے ٹھاکر جی کو تکریم کے ساتھ کھاٹ پر بٹھایا اور ان کی چھڑی کو خود پکڑے کھڑے رہے۔

''سب تو کُشل ہے نہ استاد؟'' ٹھاکر جی نے استاد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں ٹھاکر جی، ادھر تو سب ٹھیک ہے.....لیکن آپ بے وقت.....خیریت تو ہے نہ؟''

''ایک دم خیریت ہے.....ہم کیول اتنا کہنے آئے ہیں کہ اب گاؤں کی مریادا کا سوال ہے.....اس بار بھی پُرسکار کی رقم گاؤں سے باہر نہیں جانی چاہئے.....ویسے بھی یہ آپ کا آخری دنگل ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا ٹھاکر جی انشاء اللہ.....آپ بالکل بے فکر رہیں.....ابھی میں اتنا بوڑھا نہیں ہوا ہوں.....''

مقابلے کی تاریخ آن پہنچی تھی۔

گاؤں کے باہر ٹھاکر جی کے ہی ایک باغیچے میں بنے بیس بیس فٹ لمبے چوڑے اکھاڑے کو نئے سرے سے تیار کیا گیا تھا۔

اکھاڑے کے مشرقی سرے پر پرگاس پور کے تین چار نوجوان پہلوان ہیرالال اہیر کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے تھے اور اس گاؤں کے کافی لوگ ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ مغربی جانب ظہور پہلوان اپنے شاگردوں کے ساتھ تشریف فرما تھے اور ان کی پشت پر تقریباً پورا نیا بازار کھڑا تھا، شمال کی جانب ایک بڑا اسٹیج سجایا گیا تھا جس پر ٹھاکر جی صدر نشیں تھے۔ ساتھ میں گاؤں کے سرپنچ، مکھیا اور ضلع کے ایس ڈی ایم صاحب ٹھاکر جی کی دعوت پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے براجمان تھے۔ ان کے علاوہ کشتی میں حصہ لینے والے پہلوانوں کے گاؤوں کے ایک ایک سر برآوردہ شخصیات تھیں۔ جنوب کی جانب ضلع کے قریب و دور گاؤوں سے آئے ہوئے پہلوان کرسیوں پر بیٹھے تھے اور ان کے پیچھے ان ہی گاؤوں کے دنگل پریمیوں کا ایک جم غفیر تھا۔ ان کے علاوہ بے شمار نوجوانوں نے اکھاڑے کی چاروں طرف کے پیڑوں پر اپنے بیٹھنے کا انتظام کر لیا تھا۔

اسٹیج پر سامنے ایک لمبی میز تھی جس پر نوٹوں کی کئی گڈیاں سجا کر رکھی گئی تھیں۔ اسٹیج پر موجود مہمانوں کے سامنے پانی کی سربمہر بوتلیں اور کانچ کے صاف شفاف گلاس رکھے ہوئے تھے۔ مائیک سیٹ کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

وقت مقررہ پر کشتی کے مقابلے شروع ہوئے۔

پہلے چھوٹے بڑے بارہ مقابلے مقامی اور بیرونی پہلوانوں کے ہوتے رہے۔ جیتنے والے پہلوانوں کے نام کا اعلان مائیک سے ہوتا اور مہمانِ خصوصی ایس ڈی ایم صاحب اپنے ہاتھ سے نوٹوں کی ایک گڈی انعام میں دیتے۔ شکست خوردہ پہلوانوں کو ایک ایک عدد گمچھا، جانگھیہ، گنجی، لنگوٹ اور دو کھلی پان پیش کئے جاتے۔ یہ فرض سرپنچ جی ادا کر رہے تھے۔

آخر میں وہ گھڑی آ پہنچی جس کا مجمع کو انتظار تھا اور جس کے لئے پورے ضلع میں

ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا۔ سب سے پہلے ظہور پہلوان کے نام کا اعلان ہوا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر اکھاڑے میں پہنچے اور کنارے کھڑے ہوکر آسمان کی طرف دیکھ کر کچھ بدبدائے۔

پھر مائیک پر ہیرالال کا نام پکارا گیا۔ ہیرالال اپنے خیراندیشوں کے بیچ سے اٹھ کر اکھاڑے کے قریب پہنچ کر کنارے کی ایک مٹھی مٹی لے کر ماتھے سے لگایا اور اچھل کر اکھاڑے پر چڑھ گیا۔

ہیرالال پینتیس چالیس برس کا جوان تھا۔ باغیچے کے پیڑوں سے چھن چھن کر آتی سورج کی روشنی میں اس کا کسرتی اور گٹھیلا بدن چمک رہا تھا۔ لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کا قد ظہور پہلوان سے کچھ دبتا ہی ہوا معلوم ہوتا تھا۔

پورا مجمع سانس روکے ہوئے تھا۔

دونوں پہلوانوں نے سب سے پہلے اکھاڑے کی روایت کے مطابق ہاتھ ملایا اور چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کشتی شروع ہوگئی۔ بہت دیر تک دونوں پہلوان زور آزمائی کرتے رہے۔ ظہور پہلوان داؤ لگاتے تو ہیرالال اس کی کاٹ کر دیتا۔ ہیرالال کوئی پیچ لگاتا تو ظہور پہلوان اس کا توڑ کر دیتے۔

پورا مجمع خاموش تھا۔ کہیں سے کسی قسم کی آواز نہیں آرہی تھی۔ صرف اکھاڑے میں دونوں پہلوانوں کے تال ٹھونکنے یا بدن کے ٹکرانے کی آواز آرہی تھی۔

اسٹیج پر بیٹھے لوگ بھی خاموش، ایک ٹک اکھاڑے کا منظر دیکھ رہے تھے۔

اچانک ہیرالال نے ایک ایسا داؤ لگایا کہ استاد ظہور اس کی کاٹ نہ کر سکے اور چاروں خانے چت ہوگئے۔

تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور واہ واہیوں کی آوازوں سے مشرقی اور جنوبی جانب ایک شور برپا ہوگیا۔ مغربی جانب تو جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ صرف سانسوں کے زیر و بم کی آوازیں تھیں۔ خود ٹھاکر جی کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو خون نہیں۔ انھوں نے کرسی کے ہتھوں کو مضبوطی سے اپنی ہتھیلیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھیں خدشہ ہو کہ وہ کرسی سمیت اسٹیج سے گر پڑیں گے۔

پھر دنگل پریمیوں نے وہ منظر دیکھا جو انھوں نے آج تک کسی دنگل میں نہیں دیکھا تھا۔

ہیرالال نے اکھاڑے پر چت پڑے استاد ظہور کے ہاتھوں کو پکڑ کر نہایت احترام سے اٹھایا اور ان کے پاؤں چھوئے۔ استاد نے جلدی سے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور گلے لگالیا۔ یہ دلوں کو چھو لینے والا ایک نظارہ تھا۔

دنگل کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔

نیا بازار کے سبھی ناظرین بوجھل قدموں سے گاؤں لوٹنے لگے۔ اس سال یہ تھوڑی سی دوری بہت کٹھن اور طویل لگی۔

اس بار نیا بازار سے جو لوگ کسی وجہ سے دنگل دیکھنے نہیں جا سکے تھے وہ گھر کے باہر کھاٹ ڈالے، کنویں کے چبوترے یا کسی مکان کے کھلے ورانڈے پر بیٹھے، لوٹنے والوں کا انتظار کر رہے تھے۔ گاؤں کی عورتیں دروازوں اور چلمنوں سے لگیں فتحیاب ہوکر آنے والوں کے نعروں کے ساتھ جلوس کی منتظر تھیں۔

لوٹنے والوں کی بھیڑ جیسے ہی گاؤں میں داخل ہوئی منتظر لوگوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ سبھی کی آنکھوں میں انجان سے اندیشے جھلملانے لگے۔ اس بار وہ نعرہ نہیں تھا، وہ ہڑدنگ نہیں تھا، ہپ ہپ ہرے کی وہ چیخ نہیں تھی جس کا گاؤں والوں کو انتظار تھا۔ لوگوں کا بس ایک خاموش جنگل تھا جو گاؤں کی طرف بڑھا آرہا تھا۔

ہر بار استاد ظہور اور ان کے دو تین شاگردوں کے گلوں میں پھولوں کی مالائیں ہوتی تھیں اور وہ جلوس میں سب سے آگے ہوتے تھے۔ لیکن اس بار ایسا کچھ نہیں تھا۔ پھولوں کی مالائیں تو گاؤں والوں نے وہیں اکھاڑے کے پاس ہی توڑ کر پھینک دی تھیں۔ حالانکہ استاد کے دو تین شاگردوں نے کشتی جیتی تھی لیکن استاد کی شکست کا

صدمہ اتنا گہرا تھا کہ کسی کو جیتنے والوں کو مالا پہنانے کی سدھ نہ رہی۔

اسی شام استاد اپنی بکھری کے باہر کھاٹ پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔آس پاس جیتنے والے اور دوسرے شاگرد بیٹھے تھے۔پورے گاؤں میں ایک عجیب سا سنّاٹا تھا۔ ہر سال تو جگہ جگہ شادیانے بجتے تھے، پوری آواز سے ریڈیو پر گانے سنے جاتے تھے۔گاؤں کے کیا بوڑھے، کیا جوان، کیا بچے سب کے اندر ایک ترنگ، ایک مستی بھری ہوتی تھی۔ گھروں میں عورتیں کام کرتی تھیں تو گنگناتی تھیں، لیٹی رہتی تھیں تو گنگناتی تھیں۔حتیٰ کہ بات کرتی تھیں تو ان میں بھی ایک گنگناہٹ کا احساس ہوتا تھا۔لیکن اس بار ایسا کچھ نہیں تھا۔ایسا لگتا تھا کہ پورے گاؤں کے ہر گھر سے ایک میّت دفنائی گئی ہو۔

سر جھکائے بیٹھے استاد نے اچانک محسوس کیا کہ کوئی ان کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔انھوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو ہڑ بڑا کر کھڑے ہو گئے۔ٹھاکر بھانو پرتاپ سنگھ اپنے جاہ و جلال کے ساتھ کھڑے تھے۔استاد نے ان کی چھڑی لے لی اور انھیں کھاٹ پر بٹھایا۔

اس بار استاد نے ان کے آنے کا سبب نہیں پوچھا۔ وہ جانتے تھے کہ ٹھاکر جی کیوں آئے ہیں۔

''استاد!'' ٹھاکر جی کا گلا رندھا ہوا تھا۔آنکھوں سے آبشار رواں تھا۔''آج گاؤں میں کتنا سنّاٹا پسرا ہے..... پورا گاؤں شوکا کل (سوگوار) ہے.....ایسا تو کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔''

''مجھے اس کا احساس ہے ٹھاکر جی۔''استاد کے لہجے میں تاسف تھا۔

''ہم نے تو یہ سوچ کر اتنا بڑا پرسکار رکھا تھا کہ آپ کی بیٹی کی شادی کا بوجھ کچھ کم ہو جائے گا.....ہم تو سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ آپ آخری کشتی ہار جائیں گے۔''

استاد خاموش کھڑے رہے۔

''اچھا استاد! یہ بتائیے.....ہیرا لال نے جو داؤ مارا تھا اس کا توڑ تو آپ کر سکتے تھے۔''ٹھاکر جی کے لہجے میں تلخی تھی۔

''جی ہاں ٹھاکر جی.....کر سکتا تھا۔''

''پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟''

''بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ پہلوان لوگ اکھاڑے میں صرف بدن کو چت کرنے کو جیت سمجھتے ہیں.....دلوں کو کوئی جیتنا نہیں چاہتا۔''

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا استاد۔'' ٹھاکر جی کی آنکھوں میں گہرا استعجاب تھا۔

جواب میں استاد نے بڑے آہنی لہجے میں کہا۔''ٹھاکر جی، انعامی رقم کی ضرورت مجھ سے زیادہ ہیرا لال کو تھی۔''

ٹھاکر جی حیرت سے استاد ظہور کو دیکھنے لگے۔اچانک لپک کر اٹھے اور استاد کو سینے سے لگا کر کہا۔''بھگوان قسم، آپ ہی جیت میں رہے استاد۔''

☆☆☆☆☆

بند مٹھی کا کرب

وہ جب بس سے اترا تو بھوک کی شدت سے اس کے پیٹ میں مروڑ ہو رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چکرا کر گر جائے گا۔ بھوک کی شدت کو کم کرنے کے لئے اس نے آئی ہاسپٹل کے سامنے ٹاٹا کمپنی کے بنائے ہوئے چھوٹے سے پارک میں لگے نل کے پاس پہنچ کر پانی پیا۔ تھوڑی سی راحت ملی تو پارک میں بنی ایک پتھریلی بنچ پر بیٹھ گیا اور اپنی بائیں ہتھیلی کو دیکھنے لگا جس پر بس کنڈکٹر کا لوٹایا ہوا دو روپئے کا سکّہ تھا۔ یہ دو روپئے ہی فی الحال اس کا کل سرمایہ تھے، وہ بھی آزادنگر تک جانے کے لئے بس کا کرایہ بھر۔ اس کے علاوہ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ مگر بھوک اپنے شباب پر تھی۔

صبح جب وہ انٹرویو دینے کے لئے جانے کی تیاری کر رہا تھا تو اس کی ماں نے گڑ کی کالی چائے کے ساتھ صرف دو پتلی پتلی روٹیاں دی تھیں اور کسی پڑوسن سے قرض لے کر دس روپئے۔ یہ دس روپئے آزادنگر سے بسٹو پور تک جانے اور وہاں سے آنے کے، بس کے کرائے کے لئے تھے۔ اس سے زیادہ دینے کی استطاعت اس کی ماں کے پاس نہیں تھی۔ اور شاید اس سے زیادہ کوئی اسے قرض بھی نہیں دے سکتا تھا۔ باپ ہوتا تو شاید.... جانے والا لوٹ کر کب آتا ہے؟ باپ جب تک زندہ رہا، بیوی بچوں کا پیٹ کسی نہ کسی صورت بھرتا رہا۔ لیکن باپ کے مرنے کے بعد اولاد کی پرورش کی ذمہ داری ماں پر آئی جسے وہ پڑوس کے گھروں میں برتن مانجھ کر اور جھاڑو پونچھا لگا کر نبھاتی رہی اور اپنے تین بیٹوں اور جوان ہوتی بیٹی کی پرورش کرتی رہی۔ مگر دکھوں میں اضافہ ہوتا ہی رہا۔

زندگی کی لامحدود ضرورتوں کی تکمیل بھلا جوٹھے برتنوں کے دھونے کے عوض ملے چند روپیوں سے ہوتی ہے؟ یہ سوچ کر بہن نے بھی دو چار گھر سنبھال لئے تاکہ زندگی کی کچھ تو آسائشیں میسّر ہوں اور بھائیوں کی تعلیم جاری رہے کیونکہ آنے والے کل کی مسرتوں کا انحصار ان ہی پر تھا۔ جب بہن نے بھی گھر سے قدم نکالے تو رسوائیوں نے دامن تھام لیا۔

اور ان پریشانیوں اور رسوائیوں کے بیچ ان نے کسی طرح گریجویشن کر لیا مگر آگے کی تعلیم کے لئے حالات سازگار نہ ہو سکے۔ ماں اور بہن کے حالات پر ترس آنے لگا۔ تب وہ بھی زندگی کی دوڑ میں شامل ہو گیا۔ اس نے پوری شدت سے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔

بھوک کی شدت میں اضافہ ہوتا ہی جا رہا تھا۔ دو پتلی پتلی روٹیاں کب تک سہارا دے سکتی ہیں؟ تقریباً آٹھ گھنٹے ہو گئے تھے اسے کچھ کھائے ہوئے۔

چونکہ انٹرویو کے لئے وہ وقت سے پہلے ہی گھر سے نکلا تھا اس لئے ساکچی تک پیدل ہی آیا تھا۔ اس طرح اس نے ایک اسٹاپج کا کرایہ دو روپئے بچا لئے تھے۔

انٹرویو میں اپنے نمبر آنے کا اسے کافی انتظار کرنا پڑا تھا۔ انتظار کے دوران جب بھوک کا احساس ہوا تھا تو بچائے گئے دو روپئے کی مونگ پھلی لے کر بھوک کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

''مونگ پھلی!'' وہ بدبدایا۔ مونگ پھلی یاد آتے ہی بھوک کا احساس کچھ اور ہی بڑھ گیا۔ اس نے بچے ہوئے دو روپئے کے اکلوتے سکّے کو کس کر مٹھی میں دبا لیا۔

''دے بابا۔'' اچانک اس کے کانوں میں ایک دردناک آواز آئی۔ اس نے آواز پر دھیان دیا تو اسے احساس ہوا کہ ''دے بابا'' کی صدائیں تو وہ بہت دیر سے سن

رہا ہے۔

پارک کے کنارے بنے فٹ پاتھ پر بیٹھا اندھا فقیر کافی دیر سے صدائیں لگا رہا تھا۔ بازگشت کی طرح یہ صدائیں بار بار اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ بلکہ بس سے اتر کر جب وہ پارک میں داخل ہو رہا تھا تو اس وقت بھی اس کی نگاہیں اس فقیر پر پڑی تھیں۔

اس نے سر گھما کر پارک سے باہر فٹ پاتھ پر بیٹھے فقیر کو دیکھنے کی کوشش کی اور پھر مٹھی کھول کر ہتھیلی اپنے سامنے پھیلا دی۔ سکّہ ہتھیلی کی نمی سے چمک رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں یاسیت سے بھر گئیں۔ کبھی وہ اپنے سکے کو دیکھتا کبھی اندھے فقیر کی جانب۔ کچھ سوچ کر اس کی آنکھوں کے چراغ بجھ گئے۔

کتنی مماثلت ہے میری اور اس فقیر کی حالت میں۔ دونوں کے ساتھ ایک ہی مسئلہ، دونوں کا تقاضہ ایک اور فی الحال دونوں کی حیثیت بھی ایک۔ اس نے سوچا۔

ابّا نے اپنی زندگی میں کبھی کہا تھا۔ ''بیٹا! تم کبھی دوسروں کی مدد سے آنکھیں نہ چرانا.... اپنی مصیبت میں بھی دوسروں کی ضرورت کو مقدم رکھنا۔''

ابّا نے شاید ایسے ہی لمحوں کے لئے کہا تھا۔ کتنے وقت شناس تھے ابّا آپ۔ آپ زندہ رہتے تو شاید اس سکے کو اس فقیر کے حوالے کر دینا گراں نہیں گزرتا۔ لیکن اس وقت جبکہ وہ اندھا فقیر اور میں دونوں ایک ہی منزل پر ہیں، سکہ دینا کیسے گوارہ کر لوں؟ ان نصیحتوں کے علاوہ آپ نے ہمارے لئے اور کیا چھوڑا ہے؟ آپ تو ہمیشہ فراخ دل لیکن تہی دست رہے اور تنگدستی مجھے ورثے میں دی ہے آپ نے۔ اور میں بے یار و مددگار، ادھیڑ ماں، جوان بہن اور دو بھائیوں کا بوجھ اپنے ناتواں شانوں پر اٹھائے در بدر بھٹکنے پر مجبور ہوں..... ابّا! کتنے مسائل پیدا ہو گئے ہیں ایک آپ کے نہ رہنے سے۔ روٹی، کپڑا اور مکان کا کرایہ، کتابیں، فیس، دوائیں، جہیز، ضرورتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ۔

''دے بابا!'' فقیر کی صدا پھر آئی تو اس کے خیال کا تسلسل ٹوٹ گیا اور دو روپئے کے سکے پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

انسان کو اپنی اکلوتی چیز سے کتنی محبت ہوتی ہے!

سکے پر گرفت پڑنے کے ساتھ ہی اس کی بھوک پھر جاگ گئی۔

بھوک۔سکہ

سکہ۔کرایہ

فقیر۔سکہ

سکہ۔ابّا

نصیحت۔سکہ

سارے الفاظ ایک سکے سے جُڑے ہوئے اپنی حقیقت تسلیم کرانے کی کوشش میں بے معنی سے ہو کر رہ گئے تھے۔ اس نے پھر مٹھی کھول کر سکے کو غور سے دیکھا اور مٹھی بند کر لی۔

''سکہ دے دوں جا کر اس فقیر کو؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ یہ سوال اس نے کیا تھا جس کے باپ نے مصیبت کے وقت بھی دوسروں کی مدد کرنے کی نصیحت کی تھی۔ لیکن اس کے اندر کے بھوکے اور روٹی کے ضرورت مند نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کیا۔

''گھر کیسے جاؤ گے؟ بھوک کی شدت سے تم دو قدم بھی نہیں چل پا رہے ہو؟''

''تو کیا ہوا؟.... کسی کی مدد کرنے کا جذبہ پیدل چلنے کی قوت عطا کر دے گا۔''

''خام خیالی ہے.... تم کو بھوک کی شدت سے نقاہت ہو رہی ہے.... اور تمہارے پاس پیٹ بھرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں.... گھر جا کر بھی امید نہیں ہے کہ

تمہیں کھانا مل جائے گا کیونکہ تمہارے یہاں تو اکثر چولہا بھی نہیں جلتا.....''

''اچھا تو ایک روپیہ دے دوں؟''

''باقی ایک روپے کا کیا کرو گے؟''

''ایک نمکین بسکٹ کھا کر صبر کر لوں گا۔''

بھوکا، بے روزگار گریجویٹ اور مرحوم باپ کی نصیحت پایا ہوا بیٹا، دونوں ایک دوسرے کو کافی دیر تک سمجھاتے رہے۔ آخر کار نصیحت یافتہ بیٹے نے فیصلہ کیا کہ فقیر کو کچھ دینا چاہئے۔ پورا دو روپئے کا سکہ یا اس کا کچھ حصہ ہی سہی۔

اس نے مٹھی کھول کر سکے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا اور مٹھی بند کر کے اٹھ گیا۔ پارک سے باہر آیا۔ چند قدم کے فاصلے پر اندھا فقیر کپڑا بچھائے، بیٹھا صدائیں لگا رہا تھا۔ فقیر کے پاس پہنچ کر وہ چند ثانیے تک اس کو تکتا رہا اور اس نے فیصلہ کر کے بند مٹھی کے سکے کو فقیر کے پھیلائے کپڑے پر رکھ دیا اور کپڑے پر بکھرے ہوئے سکوں میں سے ایک سکہ اٹھا کر پہلے ہی کی طرح اپنی مٹھی میں رکھ لیا۔

''بھگوان بھلا کرے بابو۔'' فقیر نے پیسہ رکھنے کی آواز سن کر دعا دی۔

باپ کی نصیحت، پیٹ کی ضرورت، اپنا سکہ اور اندھے فقیر کی دعا سب اس کے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔

اس کے چہرے پر اب عجیب سا سکون چھایا تھا۔ آنکھوں میں دبی دبی سی خوشی کی چمک تھی۔

اب وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا چل پڑا۔ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ سامنے ہوٹل دیکھ کر اس کی بھوک پھر بیدار ہوگئی۔ پیٹ میں بل پڑنے لگے۔ اس نے ایک بار پھر اپنی مٹھی کو کھول کر فقیر کے کپڑے سے اٹھائے سکے کو غور سے دیکھا اور بد بدایا۔

''اونہہ....چلو دیکھا جائے گا۔''

وہ ہوٹل میں داخل ہوگیا اور ایک بنچ پر بیٹھ کر چھوکرے کو آواز دے کر دو سموسوں کی فرمائش کی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ کاؤنٹر پر پیسے ادا کرنے پہنچا تو ہوٹل کے چھوکرے نے ہانک لگائی۔ ''صاحب سے دس روپیہ لینا۔''

اور وہ اپنی مٹھی میں دبے سکے کو کاؤنٹر پر رکھ کر ہوٹل سے نکل گیا۔ کیش کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے دس روپئے کا سکہ اٹھا کر گلّے میں رکھ لیا۔

☆☆☆☆☆

بدولت

''سالا ایسا باپ خدا کسی دشمن کو بھی نہ دے۔''اس نے تنفر آمیز لہجے میں کہا اور غصے کی شدت سے زمین پر تھوک دیا۔

ایسے جملے وہ اکثر ادا کرتا ہے اور اسی نفرت، اسی غصے سے وہ زمین پر تھوک دیتا ہے۔ وہ جب بھی میرے پاس آتا ہے اپنی گھریلو زندگی کا دفتر کھول دیتا ہے۔ باپ کی اپنے تئیں نفرت کا ہی ذکر کرتا ہے۔ کبھی کبھی اپنی ازدواجی زندگی میں گھلے زہر کی بابت بھی گفتگو کرتا۔ بس ایسا ہی معلوم ہوتا جیسے اس کی زندگی میں مسرت نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔ صرف دکھ ہی دکھ ہیں۔ دکھوں کا اتھاہ سمندر۔ لامحدود غموں کا ایک طویل سلسلہ۔ چہرے پر کبھی بشاشت کی جھلک تک نہیں ملتی۔ ہونٹوں پر تبسم کی لکیریں نہیں مچلتیں۔

اتنی بڑی دنیا میں شاید میں ہی اس کا ایک ہمدرد تھا جو وہ مجھ سے ساری باتیں بتاتا۔ ذاتی، گھریلو، ازدواجی باتیں۔ باتیں کرتے وقت چہرے کا تناؤ صاف جھلکتا۔ اپنے باپ سے اسے حد درجہ نفرت ہو چکی تھی۔ اپنے باپ کے تئیں زبان کا سارا زہر اگل کر بھی اسے چین نہ پڑتا۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد اس کے چہرے پر سکون کی پرچھائیاں ہونی چاہئیں، مگر گفتگو کرنے کے بعد بھی اس کی پیشانی مچلتی ندی کا منظر پیش کرتیں، آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹتیں، نفرت کی شدت سے ہونٹ دیر تک سکڑے رہتے۔ کبھی کبھی شدتِ جذبات سے وہ رو پڑتا تو مجھے دلاسہ دے کر چپ کرانے میں کافی دقت ہوتی۔

''یار مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ میں خودکشی کر لوں گا....گھر پر میری کوئی وقعت نہیں ہے....تف ہے میری زندگی پر....باپ کی لعن طعن نا قابلِ برداشت ہو گئی ہے....ماں کی وہ ممتا میرے ساتھ نہیں ہوتی جس کا میں متمنی ہوں....بیوی کو شکایت رہتی ہے کہ اسے اس کا حق نہیں ملتا....اس کی فرمائشیں پوری نہیں ہوتیں....تم ہی بتاؤ، میں کہاں سے اس کی فرمائشیں پوری کروں؟....کیا میری حالت ایسی ہے؟....اسے خود سوچنا چاہئے....مجھ سے زیادہ میرے چھوٹے بھائی کی عزت ہے گھر میں....اس لئے کہ وہ کماتا ہے....مہینے میں دس ہزار روپئے باپ کے ہاتھ پر رکھتا ہے....اس کی تعریفیں کی جاتی ہیں....اور ایک میں ہوں...اتنا پڑھ لکھ بھی ناکارہ ہوں....باپ سمجھتا ہے کہ میرا وجود گھر کے لئے ایک بوجھ ہے....میرے ساتھ میری بیوی اور بچوں کو بھی زہر بجھے کلمات سے نوازا جاتا ہے....میری ازدواجی زندگی میں زہر گھل گیا ہے....بیوی کی وہ التفات نہیں جس کا ایک شوہر متمنی ہوتا ہے....کیونکہ اسے بھی ساس سسر کے طعنے سننے پڑتے ہیں....حالانکہ میں اپنی بھرپور کوشش کرتا ہوں کہ کہیں سے بھی چھوٹی موٹی ہی نوکری مل جائے، لیکن نوکری بھی سالی....تم تو جانتے ہی ہو اس دور میں نوکری حاصل کرنے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں....میرا باپ مجھ پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرے گا ورنہ کوئی چھوٹی موٹی نوکری حاصل کرنے میں آسانی ہوتی....میری چاروں طرف دکھوں کا گھنا جنگل ہے، اتنا گھنا کہ اس سے نکل کر سکھ کا کوئی راستہ پا جانا مشکل نظر آتا ہے۔'' وغیرہ وغیرہ

یہ اس کی تمام گفتگو کا ماحصل تھا۔

واقعی اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ قصوروار تو اس کے ماں باپ تھے جنھوں نے کم عمری میں اس کی شادی کر کے اپنے پہلے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی تمنا پوری کی تھی۔ لیکن بیٹے کی زندگی کو جہنم بنا دیا تھا۔

میں اس کا دوست ہونے کے ناطے اسے اکثر سمجھاتا، دلاسے دیتا، اس کے دکھ کو

بانٹنے کی کوشش کرتا، اس کے والد کے تئیں اس کے دل میں اچھے خیالات کو جگہ دینے کی سعی کرتا۔ مگر ہمیشہ ناکام رہتا۔ دراصل اس کے دل و دماغ میں آگ کی جو بھٹّی دھدھک رہی تھی اس بجھانے میں میری مخلصانہ گفتگو کے چند قطرے ناکام رہتے۔

میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ ہائی اسکول کی معصوم زندگی سے لے کر کالج کی رنگین زندگی تک اس کا اور میرا ساتھ رہا ہے۔ میں اس کی عادات، اس کے مزاج، اس کے خیالات، اس کی پسند و ناپسند، اس کے جذبات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پہلے وہ ایسا نہیں تھا۔ پہلے تو وہ ایک کھلنڈرا، ہنس مکھ اور بذلہ سنج شخص تھا۔ بات سے بات پیدا کر کے ساتھیوں کو ہنسانا، بات بے بات زندگی سے بھرپور قہقہہ لگانا اس کا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا۔ بےفکری، ہمتِ مردانہ اس کی شخصیت کے اہم اجزا تھے۔ مگر اب تو وہ ایسا نہیں ہے۔ اب تو وہ بس غم کا ایک پتلا معلوم ہوتا ہے۔ مایوسی، اداسی، غمگینی گویا اس کے زندگی کے جزوِ لاینفک بن گئی تھیں۔

اس نے زندگی کی تیس بہاریں دیکھ لی تھیں۔ نہیں نہیں، تیس نہیں بلکہ بیس ہی بہاریں کہنا مناسب ہوگا۔ کیونکہ شادی کے بعد کے دس برس تو اس کے لئے خزاں ہی ثابت ہوئے ہیں۔ خزاں کا موسم تو سال میں ایک بار آتا ہے مگر اس کے لئے ہر دن، ہر لمحہ خزاں کا نمائندہ تھا۔ خزاں ہی خزاں۔ ان دس برسوں میں گویا بہار اور اس کی نیرنگیاں اس کی زندگی کی سمت آنے کا راستہ ہی بھول گئی تھیں۔

اس کی زندگی کو خزاں رسیدہ بنانے کی ذمہ داری اس کے والدین پر آتی ہے جنھوں نے محض اپنی انا اور برادری میں اپنی ناک اونچی رکھنے کی خاطر محض بیس برس کی عمر میں ہی اس کے پیروں میں ازدواجی بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ شادی کے معاملے میں اس نے بہت احتجاج کیا تھا اور کہا تھا۔ ''مجھے تعلیم مکمل کر لینے دیجئے.... جب اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا تو شادی بھی ہو جائے گی۔'' مگر اس کے والد نے ایک نہ سنی۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ ''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں.... میں تمہاری بیوی اور بال بچوں، سب کی پرورش کروں گا.... تم سمجھتے کیوں نہیں، میں نے لڑکی والوں کو زبان دے دی ہے۔''

وہ جانتا تھا کہ اس کے والد ابھی جذبات میں بہہ رہے ہیں۔ مگر جب حقیقت سے آنکھیں چار ہوں گی تو وہ اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ چنانچہ اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ چونکہ شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی، اس لئے اس کا انکار اس کے والدین اور خاندان والوں کے لئے پریشانیوں کا باعث ہوتا۔ رشتہ ٹوٹ جانے پر دوسری اولادوں کی شادیاں برادری میں ناممکن ہو جاتیں۔ اس لئے ماں نے رو رو کر اپنے پلائے دودھ اور اپنے خون کی قسم دے دے کر اسے راضی کر ہی لیا تھا۔ یہ رضامندی ہی اس کے لئے دکھوں کے ایک طویل سلسلے کی وجہ بن گئی۔ اور اب تو وہ تین بچوں کا باپ بھی بن چکا تھا۔ گویا خزاں پوری آب و تاب کے ساتھ مسلط تھی۔

تین برس قبل جب شہر میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا تو اس کے نتائج نے اس کے خیالات کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ جو لوگ اس فساد میں ہلاک ہوئے تھے ان کے پسماندگان یا اہلِ خاندان کو ریاستی سرکار کی جانب سے ایک ایک لاکھ روپئے کی امداد دی گئی تھی۔ مہلوکین میں سے جو لوگ بڑی کمپنیوں میں ملازم تھے، ان کی اولاد یا لواحقین میں سے کسی ایک کو ان کی جگہ پر ملازمت دی گئی تھی۔

یہ سہولتیں دیکھ کر اس نے مجھ سے ایک دن کہا تھا۔ ''کاش! میں بھی اس فساد میں مارا گیا ہوتا تو کم سے کم میری موت کی بدولت ہی کچھ رقم میرے باپ کو مل گئی ہوتی.... اس طرح شاید اسے خوشی ہوتی.... زندگی میں تو میں نے کچھ کما کر دیا نہیں... یا پھر وہی.... دیکھ لینا، بہت جلد تمہیں میری لاش ملے گی۔''

اور میں نے اسے جھڑک دیا تھا۔ ''چپ رہو، کیسے کیسے برے خیالات تمہارے ذہن میں آتے ہیں، کیسی بزدلانہ باتیں کرتے ہو تم۔''

حالانکہ ان جملوں کے کھوکھلے پن کا احساس مجھے شدت سے ہوتا لیکن ایسے گھسے پٹے جملے بول کر میں اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرتا۔ ''کیا تمہاری حالت ہمیشہ ایسی ہی رہے گی؟ تمہارے بھی دن پھریں گے....گریجویشن تم نے کرلیا ہے....کہیں نہ کہیں ملازمت مل ہی جائے گی....دیکھو، دکھوں کی کوکھ سے خوشیاں وجود میں آتی ہیں....مایوسی گناہ ہے....مر جاؤ گے تو تمہاری بیوی اور بال بچوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا....حوصلہ رکھو میرے دوست۔''

اور وہ حوصلہ رکھنے کی کوشش کرتا۔ تبھی تو مہینے کا بیشتر حصہ ملازمت کا اشتہار دیکھنے، درخواست بھیجنے اور انٹرویوز کی تیاری میں گزرتا۔ اب تک نہ جانے کتنی کوششیں کر ڈالی تھیں لیکن اس کی کوششیں بار آور نہ ہوئی تھیں۔ اس کی زندگی ایک بے آب و گیاہ صحرا کی مانند تھی جہاں وہ پانی کے چند قطروں کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ مدتوں کی تشنگی بجھا سکے۔

ایک مرد کے زمانۂ شباب میں کئی خواہشات، کئی آرزویں اس کے دل میں کروٹیں لیتی ہیں۔ وہ کتنا ہی بے بس، کتنا ناکارہ اور ناآسودہ حال ہو، مگر وہ اپنا وقار قائم رکھنا چاہتا ہے، وہ معاشرے میں عزت چاہتا ہے، گھر کا چہیتا بننے کی تمنا رکھتا ہے، بیوی کے اٹوٹ پیار کا خواہش مند رہتا ہے۔ وہ بھی مرد ہے، جوان ہے اور وہ بھی وہی کچھ چاہتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ اس کی بیوی کی التفات اس کے تئیں نہیں ہیں، مگر گھر میں آئے دن کے تنازعات اور چخ چخ سے وہ بھی ٹوٹ پھوٹ چکی ہے، اسے بھی سکون میسر نہیں ہے۔

اگر چہ اس کے والد نے کبھی گھر سے نکال دینے کی بات نہیں کہی تھی لیکن جو باتیں وہ کہتے تھے ان سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کبھی بھی نکل جانے کا حکم دے دیں گے۔ اب تو باپ کے لعن طعن میں شدت آ گئی تھی۔ کئی بار باپ سے اس کی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ ماں بھی اس کی طرفداری کرنے کے سلسلے میں باپ کے ہاتھوں زک اٹھا چکی تھی۔ ماں بہرحال ماں ہے۔ اس کی مامتا میں شدت نہیں، مگر باپ کی طرح نفرت تو نہیں کرتی۔ اس کی خاطر جس دن اس کی ماں اس کے باپ کے ہاتھوں مار کھاتی اس دن وہ بہت غصے میں ہوتا۔ باپ سے تو کچھ نہیں کہہ پاتا، مگر سارا زہر میرے پاس آ کر اگلتا۔ ''لگتا ہے گلا دبا دوں....مگر باپ ہے....سالا ایسا باپ کسی دشمن کو نہ دے۔''

ایسا جب وہ کہتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ اس کے سینے میں باپ کی نفرت انگیز باتوں کے ان گنت تیر پیوست ہیں۔ میں ایک ایک تیر کو اس کے سینے سے نکال کر اس پر تسلیوں کے مرہم رکھتا۔

کئی بار اس نے بیوی کو طلاق دینے کی بات بھی کہی تھی۔ ایسے موقعوں پر میں ہمیشہ اس کے خیال کی رد کر کے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ ''تم دوسروں کے ستم کا بدلہ اس بے قصور سے کیوں لینا چاہتے ہو؟ ابھی جذبات میں بہہ رہے ہو....مگر آئندہ کے لئے بھی سوچا ہے؟''

میری بات کا وہ قائل ہو جاتا، مگر مجھے ہمیشہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ اپنے قول کو عملی جامہ نہ پہنا دے۔ خودکشی یا بیوی کو طلاق۔

خودکشی، جو اسے ان گنت دکھوں سے نجات دلا دیتی۔

طلاق، جو باپ سے انتقام لینے، برادری میں ان کی ناک کٹوانے کا ایک زبردست حربہ تھی۔

بس یہی دو حربے اس کے پاس تھے جنھیں وہ کبھی بھی استعمال کر سکتا تھا۔

اب کے برس بھی جب ایک مذہبی جلوس نکلنے کے موقعے پر شہر میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا تو میں نے دیکھا کہ وہ کہیں سے ایک بھدا سا دیسی پستول حاصل کر کے مورچے پر جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مجھے بے انتہا تعجب ہوا تھا۔

''یہ تمہیں کہاں سے مل گیا؟''

''مل گیا کہیں سے.... بعد میں واپس کردینا ہے۔''

''کیا کروگے اس کا؟''

''دشمن کا صفایا۔''

''خدانخواستہ تم خود شکار بن گئے تب؟''

''تب!.... زمین کا بوجھ تھوڑا ہلکا ہوجائے گا.... ہوسکتا ہے اس بار بھی سرکار مرنے والوں کے اہلِ خاندان کو معاوضہ دے.... اس طرح کچھ رقم تو میرے باپ کو مل جائے گی۔''

ایسے ہنگامہ خیز موقعے پر بھی وہ اپنے باپ کی نفرت کو نہیں بھول پایا تھا۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ''یہ تم کیا کرنے جارہے ہو؟ انسانی خون کی تمہاری نظروں میں کوئی وقعت نہیں.... کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم ایک تعلیم یافتہ انسان ہوکر انسانوں کی جان لینے نکلے ہو.... کیا لوگوں کی اس مورچہ بندی سے دنگے فساد کا خاتمہ ہوجائے گا؟''

جواب میں اس نے کہا تھا۔ ''لیکن یار، دشمن کا منھ توڑ جواب تو دینا ہی ہوگا.... کیا تم چاہتے ہو کہ دشمن ہم پر وار کرے اور ہم چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھے رہیں؟''

اس وقت وہ مذہبی جذبات سے بھرا ہوا تھا اس لئے میرے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور وہ اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے مورچے پر چلا گیا تھا۔

میں دل برداشتہ ہوکر گھر آ گیا تھا۔ کانوں میں رہ رہ کر دونوں حریفین کے مذہبی نعروں کی گونج سنائی دیتی رہی تھی۔ لگتا تھا دونوں فرقوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہورہی ہو۔

پولس اور فوج کی کئی گھنٹوں کی سعی پیہم سے جب فساد رکا تو نہ جانے کتنے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ کتنوں کے لعل چھن گئے، کتنے یتیم ہوگئے، کتنی سہاگنیں بیوہ ہوگئیں، ان کا کوئی حساب نہیں تھا۔ حساب صرف اتنا رہ گیا تھا کہ ہندوؤں نے کتنے مسلمان مارے اور مسلمانوں نے کتنے ہندو ذبح کیئے۔

اور جب مجھے معلوم ہوا کہ اس کے والد بھی اس فساد کی نذر ہوگئے تو میرے گلے سے خارج ہونے والی چیخ گھُٹ کر رہ گئی۔ گویا خدا نے اس کی دعا سن ہی لی۔ وہ تو بہت خوش ہوا ہوگا۔ اگر خوش نہ بھی ہوا ہوگا تو کم از کم اپنے باپ کی موت کا اسے کوئی غم بھی نہیں ہوا ہوگا۔ مگر جب میں تعزیت کے لئے اس کے گھر گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ باپ کی چھاتی سے چمٹا بلک بلک کر رو رہا تھا۔

''آخر تو وہ اس کے باپ ہی تھے۔'' میں نے سوچا۔ ''انسانی رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں.... کل تک جس سے وہ شدید نفرت کرتا تھا آج اسی کی موت پر بے طرح رو رہا ہے۔''

فساد تھم گیا تھا۔ زندگی پھر معمول پر آ گئی تھی۔ فسادات کے جو نتائج ہوتے ہیں، ان سے مختلف اس فساد کے نہیں تھے۔ سینکڑوں انسان مرے، گھر جلے، دکانیں لٹیں، عزتیں تار تار ہوئیں، رویا پیٹا گیا، گرفتاریاں ہوئیں، کمیشن بٹھایا گیا، مقدمے چلے اور پھر لوگ سب کچھ بھول گئے۔

ہاں، اس درمیان پھر باز آبادکاری کا کام شروع ہوا۔ برسراقتدار حکومت کے وزرا اور حزب مخالف کے نیتاؤں کے سیاسی دباؤ پر اس بار مہلوکین کے اعزہ کو دو دو لاکھ روپے حکومت کی جانب سے تفویض ہوئے۔ اور حسب روایت یہاں کی بڑی کمپنیوں نے اپنے ملازمین کی ہلاکت کے عوض ان کے لواحقین کو ملازمتیں عطا کیں۔

اسے بھی فولاد کے کارخانے میں ملازمت ملی اپنے باپ کی موت کی قیمت کے طور پر۔

وقت گہرے سے گہرا زخم بھر دیتا ہے۔ تین چار مہینوں کے بعد تو بس مرنے والوں کی یادیں ہی رہ گئی تھیں۔ زندگی اتنی تیز رو ہے کہ کون مرنے والوں کے غم میں زندگی بھر روتا رہے۔ وہ اور اس کے گھر والے بھی اوروں سے مختلف نہیں تھے۔

تین چار مہینے بعد جبکہ نئی ملازمت کی کاغذی کارروائیاں مکمل ہوگئیں تو وہ ڈیوٹی پر جانے لگا۔

اور جب اسے پہلی تنخواہ ملی تو اس نے باپ کی یاد تازہ کرنے اور ان کے ایصال ثواب کی خاطر فقرا کو کھانا کھلایا۔اور احباب واقربا کی شاندار دعوت کی۔

مجھے بھی اس نے دعوت دی تھی، مگر میں نے شرکت نہیں کی۔ کیونکہ اب مجھے اس سے نفرت ہوگئی تھی۔ جتنا گہرا میں اس کا دوست تھا اتنی ہی گہری نفرت میں اس سے کرنے لگا تھا۔

آخر میں اس سے اتنی نفرت کیوں کرنے لگا تھا۔کیا اس لئے کہ اس نے باپ کی موت کو بھلا دیا تھا؟ کیا اس لئے کہ میرے سمجھانے کے باوجود وہ فساد میں شیطان کا ہم رقص بنا تھا؟ کیا میں اس کی نئی نئی خوشیوں، آسودگیوں سے حسد کرنے لگا تھا؟

نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

نفرت تو اس لئے تھی کہ اس نے ایسی انسانیت سوز حرکت ہی کی تھی۔

دنیا جانتی ہے کہ اسے یہ ملازمت فساد میں مارے گئے اس کے باپ کی بدولت ملی ہے۔لیکن اس نے صرف مجھے بتایا تھا کہ یہ ملازمت، فساد کے دن مورچہ پر لے گئے اس بھدے سے دیسی پستول سے نکلی گولی کی بدولت ملی ہے۔

☆☆☆☆☆

پگلی

جادوگر کے گرد محلے کے تقریباً تمام بچے دائرہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ایک طرف بڑے لڑکے اور مرد حضرات کھڑے تھے اور دوسری طرف ایک مکان کے لمبے، کھلے برآمدے میں عورتوں اور جوان لڑکیوں کی بھیڑ تھی۔ اس بھیڑ میں وہ بھی جادوگر کے کمال بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ عورتوں کی بھیڑ میں وہ شاید سب سے نمایاں تھی۔ دراز قد، بڑی بڑی، کھوئی کھوئی سی متجسس آنکھیں اور چہرے پر انجان کرب کی شکنیں اس کی شخصیت کی غماز تھیں۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے جوانی کی دہلیز کو، ایک مدّت ہوئی، پھلانگ لیا ہے۔

جادوگر کئی ایک کھیل دکھا چکا تھا۔اب وہ رٹے رٹائے جملے دہرا رہا تھا۔

’’مہربان....قدردان....ماؤ اور بہنو!...اب دیکھئے یہ آخری کھیل....‘‘

اتنا کہہ کر اس نے چادر پر بکھرے سامان میں سے ایک بڑا سا مخصوص ڈبّہ اٹھایا۔ ڈبے کا ڈھکن کھول کر اس نے سب کو دکھا کر کہا۔’’دیکھئے، ڈبہ بالکل خالی ہے....ہے نہ بھائی صاحب؟‘‘ اس نے ڈبہ ایک صاحب کی آنکھوں کے قریب لا کر کہا۔اس آدمی نے جادوگر کی تائید کی۔

پھر جادوگر ڈبے کا ڈھکن بند کر کے اس پر ایک بڑا سا کپڑا ڈال کر منتر پڑھنے لگا۔ چند ثانیے کے بعد اس نے ڈبے کا ڈھکن ہٹا کر اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک خرگوش تھا۔

تمام بچے تالیاں پیٹنے لگے۔

عورتوں کی بھیڑ میں وہ بھی جادوگر کے کمال بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔
لیکن اس جادو سے اس کے چہرے پر کوئی تغیر نہیں ہوا۔آنکھیں ویسی ہی خوابیدہ سی تھیں اور چہرے پر انجان کرب کی شکنیں بدستو موجود تھیں۔

ادھر جادوگر کہہ رہا تھا۔''مہربان...قدردان...ماؤ اور بہنو!...اس دنیا میں اوپر والے نے ہر ایک کا جوڑا بنایا ہے...اس خرگوش کا بھی...'' اتنا کہہ کر اس نے خرگوش کو ڈبے میں بند کر کے سابقہ عمل دہرایا۔دوبارہ ڈھکن اٹھا کر، ڈبے میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو اس بار اس کے ہاتھ کی گرفت میں دو خرگوش لٹک رہے تھے۔

بچے بے تحاشہ تالیاں پیٹ رہے تھے۔

عورتوں کی بھیڑ میں وہ خوابیدہ آنکھوں والی، جادوگر کے کھیل انہماک سے دیکھنے والی اس بار چونک پڑی۔چہرے پر پھیلی انجان کرب کی ساری شکنیں غائب ہو گئیں۔آنکھوں میں اب نادیدہ خوشیوں کی چمک تھی۔ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں میں کئی ایک چراغ جل اٹھے ہوں۔

اچانک عورتوں کی بھیڑ سے وہ درّانہ وار نکل کر جادوگر کے پاس پہنچ گئی۔

سبھی تماشائی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔جادوگر بھی اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے پر چھائی ہوئی وحشت دیکھ کر گھبرا گیا۔

''جادو والے!'' اس نے ہلکی مگر جوش بھری آواز میں کہا۔'' میرا ایک کام کردو...میں تمھیں منھ مانگا انعام دوں گی۔''

اور اس نے جادوگر کا بازو تھام لیا۔جادوگر کو اس کے ہاتھوں کی گرفت کا احساس بہت شدت سے ہوا۔

''ج...ج...ج...جی...'' جادوگر ہکلایا۔

''سچ کہتی ہوں...بھاری انعام دوں گی...میرے باپ نے میرے لئے جہیز میں جو کچھ جمع کیا ہے، سب تمھیں دے دوں گی...'' جذبات کی شدت سے اس کے لبوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

''ک...ک...کہئے...ک...ک...کیا کام ہے...؟'' جادوگر نے جلدی سے پوچھا۔

''مجھے اس ڈبے میں بند کر دو۔''

''اس ڈبے میں؟'' جادوگر حیران تھا۔

''ہاں...ہاں...'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''لیکن...لیکن...کیوں؟''

''تم مجھے اس ڈبے میں بند کر کے.....میرا بھی جوڑا نکال دو نہ!''

کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور جادوگر کے بازوؤں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔انجان کرب کی ساری شکنیں واپس لوٹ آئیں۔آنکھوں میں جلتے ہوئے وہ سارے چراغ بجھ گئے۔اس کی سانسوں کا زیروبم تیز ہو گیا۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ چلچلاتی دھوپ میں طویل مسافت کے بعد کسی برگد کی گھنی چھاؤں میں کھڑی ہو گئی ہو۔

جادوگر سہا سہا کھڑا تھا۔اور دفعتاً وہ کھوئی کھوئی آنکھوں والی لڑکی سبھی تماشائیوں سے بے نیاز، بے تحاشہ قہقہہ لگانے لگی۔قہقہہ لگاتے لگاتے اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ادھر بچے چیخ رہے تھے۔''پگلی ہے...پگلی...پگلی۔''

☆☆☆☆☆

روٹی مانگتی زندگی

شاید پوری قوت سے بریک لگایا گیا تھا جس کی وجہ سے کار کے پہیے بری طرح چیخ پڑے۔ کار والے نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ آدمی جو اس کی کار کے سامنے اچانک آ گیا تھا، بچ جائے مگر زد میں آ کر وہ سڑک کے کنارے الٹ ہی پڑا۔ پہیوں کی چیخ سے ارد گرد کے لوگ چونک پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک جم غفیر کار کے نزدیک جمع ہو گیا۔ کار والا بے حد گھبرایا گیا۔ وہ فوراً اتر کر اس آدمی کی طرف لپکا جو اس کی کار کی زد میں آ کر زخمی ہو گیا تھا۔

"چوٹ تو نہیں آئی؟" اس نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ارے چوٹ کی پوچھتے ہو.... سر پھٹ گیا.... بے ہوش ہو گئے ہیں... اندھے ہو کر کار چلاتے ہو؟" وہ عورت جو زخمی آدمی پر جھکی ہوئی تھی، کار والے پر برس پڑی۔

کار والا اور زیادہ گھبرا کر ادھر ادھر تاکنے لگا۔ عورت، جو شاید زخمی اور بے ہوش شخص کی بیوی تھی، کی زبانی سر پھوٹنے اور بے ہوش ہو جانے کی بات سن کر، ارد گرد جمع ہوئے لوگوں کے تیور بدل گئے۔

"یہ کار والے اپنے کو لاٹ صاحب کا بھتیجا سمجھتے ہیں۔" ایک تیکھی آواز آئی۔

"غریبوں کی جان کی کوئی قیمت نہیں.... آنکھیں پھوڑ کر چلتے ہیں۔" دوسری آواز تھی۔

"پی کر چلاتے ہیں سالے..... بس سمجھ لیتے ہیں کہ سڑک اپنے باپ کی ہے۔"

"مارو سالے کو.... سب پینا نکل جائے گا۔" کئی تیکھی اور زہریلی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

ان نوکیلی، تیکھی، زہریلی آوازوں کو سن کر کار والے کی بدحواسی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے نہیں پی ہے بھائی!... یقین کیجئے.... میرا کوئی قصور نہیں.... دیکھ کر سڑک پار کرنا چاہئے تھا.... یہ خود ہی اچانک کار کے سامنے آ گئے تھے.... میں نے پوری کوشش کی تھی بچانے کی...."

"لو اور سنو!" زخمی کی بیوی چیخ کر بولی۔ "ہم لوگ مرنے کے لئے ان کی کار کے نیچے آ رہے تھے.... ہماری جان فالتو ہے نہ؟... کوئی بہانہ نہیں چلے گا.... میں چھوڑوں گی نہیں..... بہت چوٹ آئی ہے.... نکالو علاج کے پیسے!"

اس عورت کی آواز میں تیزی بھی تھی اور رقت بھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب رو پڑے گی کہ تب۔

"اچھا چلو میں انہیں اسپتال لے چلتا ہوں۔" کار والے نے اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اسپتال لے جاؤ گے؟" عورت نے منہ بنا کر کہا۔ "چکمہ کسی اور کو دینا..... میں امیروں کے ہتھکنڈے خوب سمجھتی ہوں.... اسپتال لے جاؤ گے اور چھوڑ کر چلتے بنو گے..... یہیں نکالو پیسے...."

"لیکن.... لیکن.... میں...." کار والا بڑے پس و پیش میں پڑ گیا۔

مجمع کے لوگوں کو اس عورت کی باتوں میں کافی وزن معلوم ہوا۔ سب سے پُر اثر تھے اس کے آنسو۔ اسی لئے کار والے کی ہچکچاہٹ دیکھ کر لوگوں کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ کسی نے کار کے بونٹ پر ایک زوردار گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "ایسے نہیں مانیں گے.... ان کو لے چلو تھانے...."

"تھانے؟" کار والے نے سوچا، تھانے میں دوگنا، تین گنا خرچ ہو جائے گا۔ کہیں زیادہ ہی لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ وہاں جا کر اس بدذات عورت کو تو دینا ہی

پڑے گا، اس سے کہیں زیادہ تھانے والوں کو۔ کون لفڑے میں پڑے۔ اگر انکار کرتا ہوں تو یہ لوگ قیمتی کار کا ستیاناش کر دیں گے۔

اسے خاموش دیکھ کر کسی نے کار کے شیشے پر اپنا غصہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا خیال ہے؟....بچ کے نہیں جا سکتے۔''

کار والا گھبرا کر بولا۔ ''دیکھئے بھائی....سنیئے تو سہی....آپ لوگ جو کہیں ماننے کو تیار ہوں....کار کا کیا قصور ہے؟....میں علاج کے لئے پیسے دے رہا ہوں۔''

اور پھر اس نے اپنے پرس سے فوراً پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر عورت کی طرف بڑھا دئے۔ عورت لوگوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں درد تھا، یاسیت تھی، شرمندگی تھی۔ اپنی مجبوری اور بے کسی کے تعلق سے اس کی نگاہوں میں ایک عجیب سوال تھا۔ شاید وہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا اتنا معاوضہ کافی ہے؟

''ارے اب دیکھتی کیا ہے؟ چل رکھ....جلدی کر....وہ بیچارہ بے ہوش پڑا ہوا ہے ابھی تک۔ اس کو اسپتال لے جا جلدی سے...شریف آدمی تھے یہ جو اتنی جلدی مان گئے۔'' ایک بوڑھے شخص نے ہمدردی جتائی۔

''شریف نہیں چچا....لاتوں گھونسوں سے بچنے کے لئے...'' بھیڑ میں سے کسی منچلے نے اپنا تجربہ بیان کیا۔

کار والے نے موقع غنیمت جان کر کار اسٹارٹ کی اور مجمع سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ معاملہ نمٹ جانے پر لوگوں نے بھی جانے کا راستہ دے دیا۔ پھر بھی دو چار چھوکروں نے بھیڑ سے نکلتی کار پر دو چار گھونسے رسید کر ہی دئے۔

کار کے جانے کے بعد ساری خلقت بے ہوش آدمی اور اس کی بیوی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کی بیوی اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ دیکھ ایک صاحب دوڑ کر سامنے والے ہوٹل سے ایک گلاس پانی لا کر اس کے چہرے پر چھینٹے دینے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد زخمی آدمی نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ پھر وہ کراہنے لگا۔

زخمی کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اسے کئی جگہ چوٹیں آئی تھیں۔ زمین کی رگڑ سے پرانی شرٹ کئی جگہوں سے پھٹ گئی تھی۔ رفو زدہ پینٹ کی حالت مزید ابتر ہوگئی تھی۔ اس حالت میں بھی اس کے چہرے بشرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ شخص ہے۔ اس کی بیوی خوبصورت اور جوان ضرور تھی لیکن غربت نے اس کے چہرے کو کمھلا دیا تھا۔ میلی، مسکی ساڑی اس کی غربت کی چغلی کھا رہی تھی۔

دونوں کی حالت دیکھ کر لوگوں کو ترس آ گیا۔ کئی نوجوان اس کی مدد کو آگے بڑھے۔

''ارے بھئی جلدی کرو....انہیں اسپتال لے جاؤ....گہری چوٹ آئی ہے۔ کہیں ہڈی وڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔ جلدی کرو....رکشہ بلاؤ....کہیں پھر نہ بے ہوش ہو جائیں....اے رکشہ!....'' ایک نے رکشہ والے کو آواز دی۔

رکشے پر زخمی آدمی کو ''لادا'' گیا۔ اس کی بیوی اسے پکڑ کر بیٹھ گئی اور رکشہ بھیڑ سے نکل کر اسپتال کے لئے روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دور جانے پر رکشہ والے نے سوال کیا۔ ''کہا لے چلوں بہن جی؟''

''اسپتال لے چلو اور کہاں لے چلو گے۔''

''وہ تو ہم بھی جان رہے ہیں بہن جی....ہمارا کہنے کا مطلب ہے مین ہسپتال یا سرکاری؟''

''سرکاری بھئی۔'' عورت نے جواب دیا۔ ''ہم لوگ مین(Main) اسپتال جانے لائق ہیں؟''

''لیکن بہن جی!....سرکاری میں تو علاج ٹھیک سے نہیں ہوگا....دوائی، انجکشن سب کچھ آپ کو باہر سے لینا ہوگا....آپ ان کو بھرتی کرائیں گی نہ؟''

''ہاں....میں سب جانتی ہوں....پھر بھی تم وہیں لے چلو۔''

بیس منٹ بعد رکشہ سرکاری اسپتال کے احاطے میں داخل ہوا۔عورت نے شوہر کو سہارا دے کر رکشے سے اتارا۔اسے اتارنے میں رکشے والے نے مدد کی۔رکشے سے اتار کر اسے احاطے میں بنی ایک پتھریلی بنچ پر بٹھا دیا گیا۔کرایہ لے کر رکشہ والا چلا گیا۔

آدھ گھنٹہ بعد دونوں میاں بیوی اسپتال سے باہر نکلے۔مرد کے چہرے،سر ،ہاتھوں اور پیروں میں کئی جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔اس کی چال میں لنگڑاہٹ تھی۔عورت نے اسے اپنے بازو کا سہارا دے رکھا تھا۔دونوں نے باہر نکل کر ایک دوسرا رکشہ کیا۔عورت نے رکشے والے کو جگہ بتائی۔''آزاد نگر''

دن ڈھلتا جا رہا تھا اور رکشہ منزل مقصود کی جانب رواں تھا۔وہ دونوں ایک دوسرے کو بڑی دیر تک خاموشی سے دیکھتے رہے۔پھر عورت ہی گویا ہوئی۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''خراب کب تھی؟''مرد نے دھیمے سے مسکرا کر الٹا سوال کیا۔

''تم بے ہوش ہو گئے تھے۔''بیوی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا؟''مرد نے کہا اور ہلکے سے ہنس پڑا۔

''آخر ایسا کب تک چلتا رہے گا؟''بیوی نے اداس ہو کر پوچھا۔

''جب تک قسمت میں ایسا لکھا ہوگا۔''مرد کا جواب تھا۔

''لیکن سنو....یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے۔''عورت نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔اس میں محبت اور اپنائیت بھی شامل تھی۔

''کیوں؟''مرد کے لہجے میں تعجب تھا۔

''اس لئے کہ اب تک پانچویں بار ایسا ہو چکا ہے،اگر کسی دن کار کی زد میں آ کر تم سچ مچ.....''

☆☆☆☆☆

بڑے لان والا آدمی

غصے کی ایک گرم لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔میری کار دیکھتے ہی میرا آٹھ سالہ بیٹا راجیش عرف راجو، جو رام کھلاون کے لڑکے کے ساتھ کھیل رہا تھا، بھاگ کھڑا ہوا۔

''کمینہ...مردود!''میں ذہنی طور پر برانگیختہ ہو گیا۔سینکڑوں بار حرام زادے کو سمجھایا کہ اس گندے لڑکے کے ساتھ مت کھیلا کرو....مگر پھر وہی حرکت۔

ڈرائیور کے کار کو گیریج کی طرف موڑنے سے قبل ہی میں اتر گیا۔

''آج اس کمینے راجو کی اچھی طرح خبر لوں گا۔''

جس علاقے میں، میں رہتا ہوں اس علاقے میں نچلے اور درمیانے طبقے کے لوگ بسے ہوئے ہیں۔بس دو چار ہی ایسے ہیں جنہیں ''امیر'' کہا جا سکتا ہے۔جہاں میری کوٹھی ہے اس کے دو چار گھر پرے رام کھلاون کا جھونپڑی نما گھر ہے۔وہ ۴۰-۴۲ برس کا ایک غریب آدمی ہے جو ٹھیکیداری میں مزدوری کرتا ہے۔ ہے۔اس کی ایک چڑ چڑی سی بیوی،ایک سات سالہ لڑکا اور ایک دو سالہ بچی ہے۔میں جب بھی آفس سے لوٹتا ہوں تو اکثر اس کے دونوں بچوں کو دھول اور مٹی میں کھیلتا ہوا پاتا ہوں۔لڑکا مٹی اور ٹوٹی پھوٹی اینٹوں سے گھروندا بناتا اور بچی وہیں بیٹھی دھول پھانکتی رہتی۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بچی پیشاب کر کے اپنے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھوں سے مٹی گوندھتی اور اس کے بعد منہ میں بھر کر مزے سے کھاتی رہتی۔ایسا دیکھ کر مجھے کافی کراہیت محسوس ہوتی اور نفرت کا زہر میری رگ رگ میں رواں ہو جاتا۔

میرا نظریہ ہے کہ یہ غریب بچے فطرتاً گندے، غلیظ، غیر مہذب، بدکردار اور تخریبی ہوتے ہیں۔ اگر ان کے ساتھ ناز و نعم میں پرورش پائے ہوئے ہمارے بچے کھیلنے لگیں تو یقیناً وہ بھی ان ہی کی فطرت اختیار کرلیں گے۔ اگر ان سے ہمدردی کی جائے تو کل وہ سر پر بیٹھ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ میں غریبوں سے نفسیاتی اور عملی طور پر متنفر رہتا ہوں۔ اور اس کے علاوہ میری غیرت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ شیام سندر اینڈ سنس کے مالک کا، کانونٹ میں تعلیم پانے والا بیٹا کسی ایرے غیرے نتھو خیرے، رام کھلاون کے گندے اور غلیظ بچے کے ساتھ کھیلے۔

اس سلسلے میں میں اپنے بیٹے راجو کو کئی بار اونچ نیچ سمجھا چکا ہوں اور زدوکوب بھی کر چکا ہوں مگر وہ باز نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کا یہ ایک نشہ بن چکا ہے کہ اسکول سے آتے ہی کتابیں رکھیں، شام کا ناشتہ کیا تو کیا، نہیں تو بس پہنچ گیا اس دو ٹکے کے بچے کے پاس۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک وہ رام کھلاون کے بیٹے کے ساتھ نہ کھیل لے، کپڑے گرد آلود نہ کرلے تب تک اسے چین نہیں پڑتا۔

ایسا کئی مہینوں سے ہوتا آرہا تھا۔ کئی بار تو میں نے رام کھلاون کو بھی تنفر آمیز لہجے میں تنبیہ کر چکا ہوں۔ ''اپنے لڑکے کو سمجھا کر رکھو کہ میرے بیٹے کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دے... آئندہ سے اگر دیکھوں گا تو اچھی بات نہ ہوگی۔''

اور ایسے وقت رام کھلاون ہاتھ جوڑ کر، گھگھیا کر معافی مانگتا اور یقین بھی دلاتا کہ ایسا اب نہ ہوگا.... سمجھا دوں گا سرکار... بچہ ہے سرکار، کیا کروں سمجھاتا ہوں مگر مانے تب نہ۔

مگر سچ پوچھئے تو میرا راجو ہی اس میل ملاپ پر پہل کرتا ہے۔ معمول کے مطابق آج بھی اسکول سے آکر کھیل رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر بھاگ آیا۔

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ مار کھانے کے خوف سے اپنی ماں کے پاس دبکا ہے۔

''راجو....ادھر آؤ!'' میں نے گرج کر کہا۔

''نہیں ڈیڈی....اب نہیں جاؤں گا....اب نہیں جاؤں گا ڈیڈی۔'' مار سے قبل ہی وہ گھگھیانے لگا۔ کوئی دوسرا موقع ہوتا تو مجھے رحم آجاتا مگر اس وقت میرا پارہ کافی اونچائی پر تھا۔ اسے گریبان سے پکڑا اور کئی زوردار تھپڑ رسید کر کے کہا۔ ''تم تو ہمیشہ یہی کہتے ہو مگر پھر بھی چلے جاتے ہو۔'' مارے غصے کے میرا جسم پھنکنے لگا تھا۔

دریں اثنا اس پر میری گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تھی کہ وہ آزاد ہو گیا اور مزید مار سے بچنے کے لئے باہر کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے ''ٹھہر جاؤ....ورنہ خیریت نہیں ہے'' کہتا ہوا اسے پکڑنے کے لئے دوڑا۔ وہ پکڑے جانے کے خوف سے پیچھے مڑ مڑ کر مجھے دیکھ لیتا کہ کتنے فاصلے پر ہوں۔ دوڑتا ہوا وہ گاندھی میدان میں پہنچ گیا جہاں بے شمار لڑکے کھیل رہے تھے۔ یہ دوڑ دیکھ کر بچوں نے ایک تماشہ بنا لیا اور شور مچانے لگے۔ اس وقت غصے کی وجہ سے میرے ذہن میں قطعی خیال نہیں تھا کہ میں شیام سندر ہوں اور سماج میں میری ایک حیثیت ہے۔

اچانک میں بوکھلا گیا۔ راجو دوڑتا ہوا سڑک تک پہنچ گیا تھا۔ شمالی جانب سے ایک کار پوری رفتار سے آرہی تھی۔ میں پوری قوت سے چیخا۔ ''بچ کے راجو...بچ کے۔'' مگر اس پر میری مار کا خوف اتنا غالب تھا کہ اس آواز پر اس نے دھیان ہی نہ دیا اور اس نے فاصلے کا اندازہ لگانے کے لئے مڑ کر مجھے دیکھا۔ کار بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی۔

''راجو!'' خوف سے میری چیخ نکل گئی اور میں نے آنکھیں موند لیں کیونکہ راجو کار کی زد میں آچکا تھا۔ مگر آنکھ بند ہوتے ہوتے میں نے ایک جھلک دیکھی تھی کہ راجو کی طرف سڑک کی دوسری جانب سے کوئی لپکا تھا۔

بریک کی زبردست چرچراہٹ ہوئی۔ سڑک پر جیسے بھونچال آگیا۔ کار کی چہار جانب لوگوں کا مجمع لگ گیا۔ میں فوراً بھیڑ کو چیرتا ہوا کار کے نزدیک پہنچا۔ میں نے

دیکھا کہ ایک آدمی کار کے دھکے کے سبب کار سے پانچ چھ فٹ پرے سڑک کے کنارے گرا ہوا تھا۔اس کے سر سے کافی مقدار میں خون بہہ بہہ کر سڑک پر پھیل رہا تھا۔اور یہ جان کر میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا کہ راجو بالکل صاف بچ گیا اور اب بھی گرے ہوئے شخص کے بازوؤں میں تھا۔

''واقعی اس نے بڑی بہادری کا کام کیا ہے۔'' کسی نے زخمی کے بارے میں رائے دی۔

''ہاں بھئی.....میں نے صاف دیکھا ہے کہ لڑکا کار کی زد میں سمجھئے آ ہی گیا تھا مگر اس آدمی نے جان پر کھیل کر اس طرف دوڑ لگائی اور اس کو کار کی زد میں آنے سے پہلے ہی گود میں لے لیا مگر خود نہ بچ سکا۔'' کسی دوسرے نے کہا۔

''وہ تو کہئے کہ دھکا کار کی سائڈ سے لگا تھا ورنہ خیریت نہیں تھی۔'' کسی تیسرے کی آواز تھی۔

میں نے زخمی کو غور سے دیکھا اور پھر ایسا محسوس ہوا جیسے میرا وجود آہستہ آہستہ پگھلتا جا رہا ہے کیونکہ وہ آدمی کوئی اور نہیں رام کھلاون تھا۔نخوت وتمکنت کا جو پَرتو میری شخصیت پر اور امیری وکبیری کی جو جھوٹی شان مجھ پر تھی وہ اچانک غائب ہوگئی۔ ہمدردی کا ایک عمیق جذبہ میرے دل میں سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مارنے لگا۔میں نے بڑھ کر جیب سے رومال نکال کر خون رسنے کی جگہ پر رکھ کر دبا دیا۔میں اب راجو کو قطعی بھول چکا تھا۔رام کھلاون بے ہوش تھا۔جس کار سے حادثہ ہوا تھا،اس کا مالک کار سمیت فرار ہو چکا تھا۔

میں نے فوراً موبائیل فون پر اپنے ڈرائیور کو جائے حادثہ پر کار جلد لانے کی ہدایت کی۔ڈرائیور میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے توقع سے پہلے ہی کار لے کر آ گیا۔میں نے اپنے ڈرائیور اور دو چار نیک طینت لوگوں کی مدد سے اسے اٹھوایا اور کار میں سوار کرایا۔

میں نے راجو کو رام کھلاون کی گرفت سے آزاد کر کے اسے گھر جانے کی تاکید کی۔اب میرا غصہ یکدم زائل ہو چکا تھا۔اب تو اپنے بیٹے کے تئیں محبت اور شفقت کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔اگر راجو کار کی زد میں آ جاتا تو.....سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

چند گھنٹے بعد رام کھلاون میرے اخراجات پر شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں پڑا تھا۔میں اس کے بیڈ کے سرہانے کرسی پر بیٹھا بڑی اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔''رام کھلاون،تم نے کیوں میرے بچے کو بچا لیا جبکہ....''

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔''سرکار،....ہم انسان ہیں اور انسان کے کام آنا ہمارا فرض ہے۔جو انسان،انسان کے کام نہیں آتا وہ انسان نہیں حیوان ہے.....شیام بابو،اگر دولت انسان کو انسان سے محبت کرنے کی صلاحیت چھین لے.....جو دولت انسان کو دو حصوں میں تقسیم کر دے،انسان کو انسان سے جدا کر دے،جو دولت انسانی زندگی بچانے کے کام نہ آئے تو وہ دولت کس کام کی....شیام بابو،غریب بن کر بھی آپ شیام بابو رہیں گے اور امیر بن کر بھی....اگر میں دولت مند ہو جاؤں تو بھی رام کھلاون ہی کہلاؤں گا....یہ تو ہمارا ذہن،ہماری تنگ نظری ہے کہ ایک کو عظیم وکبیر سمجھیں اور ایک کو حقیر وفقیر....دولت مند ہم غریبوں کو انسانوں کے زمرے میں شمار نہیں کرتے، ان کی نفرتوں کا،مظالم کا شکار رہتے ہیں مگر ہم غریب انہیں سرکار،حضور،جناب،سیٹھ بابو کے خطاب سے نوازتے ہیں اور اسی طرح گلے لگاتے ہیں جس طرح آپ کے بچے کو میں نے لگا لیا تھا۔''

میں حیرت زدہ رام کھلاون کی گفتگو سنتا رہا۔پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ شخص ہے۔میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رام کھلاون،غربت میں پلنے والا،ایک معمولی مزدور اتنی اونچی بات کرے گا۔

غریبوں کے متعلق میرا برسوں کا نظریہ خاک میں مل گیا۔میرے دل میں غریبوں

کے لئے ہمیشہ سے جو نفرت کا زہر بھرا تھا، رام کھلاون کی عالمانہ گفتگو سے پل بھر میں معدوم ہوگیا۔ فرط جذبات سے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

رام کھلاون کی بیوی بیڈ کے پائتانے تپائی پر حزن وملال کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اسے میں نے ہی رام کھلاون کی فرمائش پر بلوایا تھا۔ میرا ڈرائیور اسے میری کار میں بٹھا کر لایا تھا۔

کچھ دیر بعد جب میں وہاں سے چلنے کو ہوا تو میں نے رام کھلاون کی بیوی کو پانچ سو کے دس نوٹ دے کر کہا۔ ''بہن، ان پیسوں سے اپنے پتی کو پھل دودھ دینا اور گھر کا خرچ چلانا...... چنتا مت کرنا.... علاج میں جتنا خرچ ہوگا، میں اٹھاؤں گا..... اور جتنے دن تمہارا پتی کام پر نہیں جائے گا اتنے دن کی مزدوری بھی میرے ذمہ رہے گی۔''

دوسرے دن میں آفس سے جب لوٹا تو دیکھا کہ رام کھلاون کا وہ بچہ اکیلا اپنی بہن کے ساتھ کھیل رہا تھا اور بار بار میری کوٹھی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اسے شاید امید تھی کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی راجو اس کے پاس کھیلنے آئے گا۔ اس کا بار بار میری کوٹھی کی طرف دیکھنا مجھے اندر، بہت اندر تک جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

میری ہدایت پر ڈرائیور نے کار کو ٹھیک ان بچوں کے پاس روکا۔ میں اتر کر ان کے پاس پہنچا اور پیار سے چمکارتا ہوا انہیں کار میں بٹھایا۔

اچانک رام کھلاون کی بیوی گھر سے نکلی اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔'' ارے ساب، میرے بچوں کو کہاں لے جارہے ہیں؟''

میں نے اپنائیت سے کہا۔'' گھبراؤ مت بہن!..... میں انہیں اپنی کوٹھی لے جارہا ہوں..... تمہارے دونوں بچے میرے راجو کے ساتھ میرے لان میں کھیلا کریں گے..... آخر اتنا بڑا لان کس کام کا؟''

کہتے کہتے میری آواز بھرّا گئی۔ میں نے دیکھا رام کھلاون کی بیوی کے ہونٹوں پر ہلکی مسکان تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

تحفظ کا احساس

رات بھیگ چلی تھی۔

اور ہٹیا پٹنہ ایکسپریس پوری رفتار سے پٹری پر دوڑ رہی تھی۔ سارے ہی ڈبے ڈھنڈھنا رہے تھے۔ کیونکہ ہولی کی وجہ سے مسافروں کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے کی حد تک تھی۔

جن کے لئے ہولی کا تہوار تھا وہ تو دن بھر رنگ اور گلال سے کپڑوں اور چہروں رنگتے رہے اور رات کو بھنگ کے پیڑے کھا کر مست پڑ رہے۔ جن کے لئے ہولی نہیں تھی وہ رنگ اور کیچڑ کے ''چھڑکاؤ'' کے خوف سے گھر سے نہیں نکلے تھے۔ یہی وجہ تھی کی مسافروں کی تعداد بہت کم تھی۔ ٹرین میں جتنے مسافر تھے وہ کسی مجبوری اور اہم ضرورت کے تحت ہی سفر کر رہے تھے۔ ایسی ہی ضرورت جس کے لئے سفر کرنا ناگزیر تھا۔

میں گیا اسٹیشن سے جب چڑھا تھا تو ڈبے میں کل گیارہ مسافر تھے۔ جس ڈبے میں میں سوار ہوا تھا، وہ اس قسم کا تھا کہ ایک جگہ کھڑے ہو کر پورے ڈبے کے مسافروں کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ صرف بیٹھنے کی سیٹیں تھیں، سونے کے لئے برتھ نہیں تھے۔

میں داہنے ہاتھ کی اٹیچی کو سیٹ پر رکھ دیا تھا اور بائیں ہاتھ کے تھیلے کو کھونٹی پر لٹکا کر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر عادتاً ڈبے کے مسافروں کا جائزہ لینے لگا تو میرا جی

دھک سے کر کے رہ گیا تھا۔ میرے سامنے والی سیٹ پر اٹھائی گیر اور جیب کترے قسم کے دو لڑکے بیٹھے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے کپڑوں اور حلیے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اٹھائی گیری ہی ان کا پیشہ ہے۔ ان میں سے ایک بیس بائیس برس کا تھا اور دوسرا چودہ پندرہ برس کا۔ میں نے عجلت میں ان کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اب؟ آج تو ٹرین میں ٹی ٹی ای بھی نہیں تھا اور نہ ریلوے پولس ہی گشت کر رہی تھی۔ اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد اب جگہ تبدیل کرنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

ٹرین پوری رفتار سے پٹری پر دوڑ رہی تھی اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جاگ کر ہی سفر کروں گا۔

''پارس ناتھ'' میں دو منٹ کے لئے ٹرین رکی تھی۔ اس اسٹیشن پر صرف تین ہی مسافر اس ڈبے سے اترے تھے۔ لیکن کئی مسافر سوار ہوئے تھے، جن میں زیادہ تعداد نوجوان لڑکوں کی تھی۔ دو تین سنجیدہ قسم کے لوگ بھی سوار ہوئے تھے۔ ان ہی میں ایک سپاہی جی بھی تھے۔ سپاہی جی اتفاق سے میری دائیں طرف کی کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ شاید ٹکٹ کے پیسے بچانے کی غرض سے وہ پوری وردی میں تھے۔ ان کی موجودگی سے مجھے یک گونہ سکون ملا۔ انھیں دیکھ کر دونوں اٹھائی گیر قسم کے لڑکے سراسیمہ نظر آنے لگے تھے۔ تحفظ کا احساس ہوتے ہیں میں اٹیچی کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ پورے چار آدمیوں کی سیٹ اپنی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اتنے آرام سے سفر کرنے کا موقع ملا تھا۔

ڈبے میں سوار نوجوان لڑکے ہولی کی خوشی میں کوئی خاص فلم دیکھنے کی غرض سے پارس ناتھ آئے تھے۔ راستے بھر وہ لڑکے فلم کے اداکاروں اور مناظر کی ہی گفتگو کرتے رہے۔ گفتگو کے درمیاں ناقابلِ بیان گالیوں کا تبادلہ بھی کرتے رہے، جس سے طبیعت بالکل مکدّر ہو گئی تھی۔

''گوموہ'' اسٹیشن پر سبھی لڑکے اتر گئے تھے۔ میں نے پرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور نہ جانے کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ مطمئن تھا کہ میرے سامنے کی سیٹ کے وہ پھٹے حال لڑکے سپاہی جی کی موجودگی میں ''کچھ'' کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔

''موری جنکشن'' کی گہما گہمی سے اچانک میری نیند ٹوٹ گئی۔ خمار آلود آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ میرے آس پاس کے تقریباً سبھی مسافر نئے تھے۔ میرے سامنے والی سیٹ پر ان دو جیب کترے قسم کے لڑکوں کی جگہ ایک سنجیدہ شخص بیٹھے تھے۔ لڑکوں کی غیر موجودگی کا احساس ہوتے ہی میری نگاہ سب سے پہلے کھونٹی پر گئی تو سن ہو کر رہ گیا۔ تھیلا ندارد تھا۔ ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ سیٹ کے نیچے دیکھا کہ شاید گر کر کھسک گیا ہو۔ لیکن مایوسی ہوئی۔ میں اضطراری طور پر ڈبے کے ایک سرے تک دوڑتا چلا گیا ان دونوں لفنگوں کی تلاش میں۔ خلاف توقع وہ دونوں اسی ڈبے میں ایک جگہ بیٹھے مل گئے۔ میں نے پہنچتے ہی پوچھا۔ ''میرا تھیلا؟''

وہ دونوں ہڑبڑا گئے۔ ''ہم نہیں جانتا بابو... وہیں تو تھا۔'' بڑے لڑکے نے جواب دیا۔

''وہاں نہیں ہے۔'' میں نے تقریباً گرج کر کہا۔

''پھر ہم کو نہیں مالوم.... اگر ہم لوگ لیتا تو یہاں بیٹھا رہتا؟''

بات معقول تھی۔ میں مایوس ہو گیا۔ تھیلے میں تقریبا تین سو روپئے کے سامان تھے۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ اس تھیلے میں ایک کلوگرام گیا شہر کے خاص بسکٹ تھے، جنھیں میں نے بڑے شوق سے بچوں کی خاطر خریدے تھے۔ بچے بڑی بے صبری سے گیا کے بسکٹوں کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ بچوں کو کیا جواب دوں گا۔ میں خود کو ایک مجرم سا محسوس کر رہا تھا۔ ان بسکٹوں سے بچوں کی خوشیاں اور میرے پدرانہ جذبات وابستہ تھے۔

میں بھاری قدموں سے چلتا ہوا اپنی سیٹ پر آ کر اداس بیٹھ گیا۔ میری کیفیت کو دیکھتے ہوئے میرے سامنے کے نئے مسافر نے سوال کیا۔ ''کیا بات

ہے....کچھ.....؟''

''ہاں....تھیلا تھا، یہاں کھونٹی پر...کسی نے پار کر دیا....''

''وہ تھیلا آپ کا تھا؟''اس آدمی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''ہاں... ہاں...کیوں...آپ جانتے ہیں کیا؟''

اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔ پھر پوچھا۔''پلاسٹک وائر کا تھیلا تھا، لال رنگ کا..... بالکل نیا؟''

''جی ہاں..... بالکل نیا تھا۔''میں نے دبے دبے جوش میں کہا۔کچھ پرامید بھی ہوا۔

''وہ تو...وہ تو...'' وہ صاحب میری جانب جھک کر، پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''اسے تو بوکارو میں ہی ایک سپاہی جی لے کر اتر گئے۔''

☆☆☆☆☆

دیش بھکت

میں تقریباً ڈھائی بجے دن بس اسٹینڈ پہنچا اور بکنگ کلرک سے ٹاٹا کے لئے ٹکٹ طلب کیا تو اس نے کہا۔''آپ کو تھوڑی دیر ہوگئی۔ چالان کٹ چکا ہے۔اب آپ بس میں ہی ٹکٹ لے لیجئے گا۔''

اتنا کہہ کر اس نے پاس بیٹھے کنڈکٹر کی طرف اشارہ کیا۔بس کنڈکٹر نے اثبات میں سر ہلا کر گویا بکنگ کلرک کی بات کی تائید کی۔اس نے کہا۔''آپ چل کر بس میں اپنی سیٹ لے لیجئے.....ہم آرہے ہیں....وہیں آپ کا ٹکٹ بنا دیں گے۔'' پھر اس نے بس کا نمبر بتایا۔

میرے ساتھ کئی مسافر تھے جو تاخیر سے پہنچے تھے۔ہم سب کنڈکٹر کے بتائے ہوئے نمبر کی بس میں آکر بیٹھ گئے۔بس بھری ہوئی تھی لیکن ابھی کئی سیٹیں خالی تھیں۔ مجھے پچھلی سیٹ پر جگہ ملی۔ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہارن بجا رہا تھا تاکہ جانے والے مسافر جلد از جلد پہنچ جائیں۔

پانچ چھ منٹ کے بعد کنڈکٹر ایک ہاتھ میں چالان کے کاغذات تھامے اور بائیں کندھے پر چمڑے کا مخصوص بیگ لٹکائے داخل ہوا اور اپنی متعین سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے ہارن دے کر بس اسٹارٹ کی۔

بس کے اسٹینڈ کے باہر نکلتے ہی کنڈکٹر نے ہانک لگائی۔''جن کا ٹکٹ نہیں بنا ہے وہ بنوالیں۔''

میں نے آگے بڑھ کر بیس روپئے کا نوٹ کنڈکٹر کو دیا۔(اس وقت رانچی سے

جمشید پور کا کرایہ اتنا ہی تھا)

اس نے کہا۔ ''آپ اپنی سیٹ پر بیٹھئے.....ہم ٹکٹ بنا دیتے ہیں۔''

میں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

بس جب نامکم کے ریلوے کراسنگ پار کر کے شہر سے باہر نکل آئی تو میں نے کنڈکٹر سے ٹکٹ کا مطالبہ کیا۔ اس نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔ ''آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں....آپ کو ٹاٹا جانا ہے نہ.....ہم کہیں بھاگے نہیں جا رہے .....آپ کے ساتھ ہی چل رہے ہیں۔''

میں خاموش ہو کر بیٹھ رہا۔ لیکن مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ دل میں ایک اندیشہ تھا کہ کہیں راستے میں چیکنگ ہوگئی تو بڑی فضیحت ہو جائے گی۔ بنڈو پہنچ کر میں نے ایک بار پھر ڈرائیور کو آواز دی۔ ''بھئی، آپ نے ابھی تک مجھے ٹکٹ نہیں دیا جبکہ میں پوری رقم آپ کو دے چکا ہوں۔''

وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے پاس آیا اور آدھی رقم مجھے لوٹا دی۔ ''اس کو رکھئے۔''

میں نے دس کا وہ نوٹ لے لیا۔ لیکن ماجرا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ پیسے مجھے کیوں لوٹا رہے ہیں؟''

''رکھئے تو سہی!'' کہہ کر وہ جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میری بغل والی سیٹ پر جو صاحب بیٹھے تھے وہ شاید میری سادہ لوحی پر مسکرائے اور مجھ سے بولے۔ ''وہ آپ کو ٹکٹ نہیں دے گا۔''

''کیوں نہیں دے گا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لئے کہ اس نے آدھی رقم آپ کو دے دی ہے اور آدھی اپنے پاس رکھے گا.....آپ کو وہ بغیر ٹکٹ دس روپئے میں ٹاٹا پہنچا دے گا.....آپ کا بھی بھلا اس کا بھی بھلا...''

''لیکن یہ تو سراسر بے ایمانی ہے.....سرکار کو نقصان پہنچانا ہے....''

''اس کی فکر اس کو نہیں ہے.....ایسا ہی ہو رہا ہے.....آج ہی نہیں.....روزانہ یہی ہوتا ہے.....ایک آپ ہی نہیں ہیں.....کئی لوگ ایسے ہیں جو کاؤنٹر سے ٹکٹ نہیں لے سکے ہیں....ان لوگوں نے کنڈکٹر کو دس ہی روپئے دئے ہیں، پوری رقم نہیں دی ہے.....آپ پہلے آدمی ہیں جس نے پورا کرایہ دیا تھا۔ چونکہ آپ کو معلوم نہیں ہے اور نئے ہیں اس لئے اس نے دس روپئے لوٹا دئے۔'' ان صاحب نے مجھے ساری تفصیل بتائی۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی کہ میرے بار بار مطالبے کے باوجود کنڈکٹر مجھے ٹکٹ کیوں نہیں دے رہا تھا۔

میں نے کنڈکٹر کو آواز دی اور کہا۔ ''آپ عجیب آدمی ہیں....میں ٹکٹ مانگ رہا ہوں تو پیسے لوٹا رہے ہیں.....یہ لیجئے یہ نوٹ ، مجھے یہ نہیں چاہئے....مجھے ٹکٹ چاہئے۔''

اس بار میری آواز میں سختی تھی اس لئے کنڈکٹر کا منھ بگڑ گیا۔ اس نے جھنجھناتے ہوئے کہا۔ ''ایسا ہی تھا تو آپ کاؤنٹر سے ہی ٹکٹ کیوں نہیں لے لئے۔''

میں نے غصے میں اس کو ڈانٹا۔ ''عجیب بات کرتے ہو تم...ارے تمھارے سامنے ہی کلرک نے بتایا تھا کہ چالان کٹ چکا ہے اب بس میں ہی ٹکٹ ملے گا...اور تم نے بھی ہامی بھری تھی....بولو جھوٹ بول رہا ہوں....مجھے تو ٹکٹ چاہئے۔''

کنڈکٹر لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کے چہرے سے ناگواری صاف جھلک رہی تھی۔

بس جب کانچی میں چائے وغیرہ کے لئے رکی تو وہ خود میرے پاس آ کر بارہ روپئے لوٹانے لگا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ زیادہ پیسے واپس مل جانے سے شاید میں رام ہو جاؤں گا۔

لیکن میں نے وہ پیسے نہیں لئے۔ میں نے زور دے کر کہا۔ ''دیکھو بھائی، میں ویسا

آدمی نہیں ہوں جیسا تم سوچ رہے ہو....میں ایمانداری سے ٹکٹ کے پیسے دیتا ہوں اور ایمانداری سے ٹکٹ لیتا ہوں.....تمھارے دئے ہوئے اس لالچ میں میں آنے والا نہیں ہوں...ٹکٹ تم کو دینا ہی ہوگا۔''

کئی مسافر بس سے اتر چکے تھے اور کئی دھیرے دھیرے یکے بعد دیگرے اتر رہے تھے۔جن لوگوں نے آدھا کرایہ دے کر ٹکٹ نہیں لیا تھا ان میں سے ایک صاحب نے طنزاً کہا۔''ارے بھائی، ٹکٹ دے دو نہ....دیکھتے نہیں دیش بھکت ہیں...دیش بھکت...''

اس طنز پر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن خاموش رہا۔راستے میں مسافروں سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔میں بھی چائے پینے کے لئے اتر گیا۔کنڈکٹر مجھ سے پہلے ہی اتر کر موٹیل میں داخل ہو چکا تھا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد بس کانچی سے روانہ ہوئی۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ دیکھیں کنڈکٹر کب ٹکٹ دیتا ہے۔اور انتظار ہی کرتا رہ گیا۔نہ تو کنڈکٹر نے ٹکٹ دیا نہ میں نے پھر مطالبہ کیا۔لیکن اندر ہی اندر اس کے اس رویّے پر میں جھلستا رہا۔

بس رڑگاؤں، چوکا، رانگاماٹی، تماڑ کے علاقوں سے پار کر گئی پھر بھی اس نے ٹکٹ نہیں دیا۔چونکہ بس کے سارے مسافروں پر معاملہ عیاں ہو گیا تھا اس لئے لگتا تھا کہ اسے ٹکٹ دینے میں اپنی سبکی محسوس ہو رہی تھی۔

بس جب چانڈل سے بھی گزر گئی تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔میں نے ایک بار پھر کنڈکٹر کو پکار کر کہا۔''اوئے بے ایمان....تم ٹکٹ دیتے ہو یا نہیں؟''

میرے اس جملے پر بے ٹکٹ حضرات مجھ پر ہی آوازہ کسنے لگے۔''بہت بڑے ایماندار ہیں.....دیش بھکت آ گئے ہیں....دس روپئے کے لئے سب ہی ایمانداری دکھاتے ہیں....ارے ان کو چڑھنے ہی کیوں دیا.....راستے بھر ہنگامہ کر کے سب کو پریشان کئے ہوئے ہیں.....''

آوازہ کسنے والوں میں کئی طرح کے لوگ تھے۔اب تو میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔میں اٹھا اور اپنے آگے کی سیٹ پر بیٹھے سجّن کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔وہ دھوتی کرتے میں ملبوس تھے۔ماتھے پر لمبا سا تلک لگا رکھا تھا۔میں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''کیوں صاحب۔میں تو نہیں لیکن آپ ضرور دیش بھکت لگتے ہیں....یہی دیش بھکتی ہے کہ دیش کو چونا لگائیے...خود تو بے ایمانی کر رہے ہیں کنڈکٹر کو بھی بے ایمان بنا رہے ہیں....سرکار کو نقصان پہنچا رہے ہیں....سرکاری کی سمپتّی آپ کی اپنی سمپتّی ہے، اس لئے کرایہ دینے کی ضرورت نہیں ہے...میں ایمانداری سے پورے پیسے دے کر ٹکٹ مانگ رہا ہوں تو یہ آپ کی نظر میں غلط ہے...مجھ پر ہی طنز کر رہے ہیں....میں بھی آپ کی طرح بے ایمان بن کر آدھی رقم جیب میں رکھ لیتا تو آپ کی نظر میں اچھا آدمی ہوتا۔''

میرے ہاؤ بھاؤ اور انداز سے وہ صاحب سٹپٹا گئے۔چونکہ اصولی اور اخلاقی جرم کے مرتکب تھے اس لئے خاموش رہے۔کوئی دوسرا موقع ہوتا تو میری ان باتوں پر فساد برپا کر دیتے۔

پھر میں آگے بڑھ کر مولوی نما شخص کے پاس پہنچ کر بولا۔''کیوں مولانا، آپ تو اہلِ ایمان نظر آتے ہیں....کیا ایمان کا یہی تقاضہ ہے....دس روپئے کے لئے اپنا ایمان بیچ رہے ہیں....شرم نہیں آتی.....آدھی رقم اپنی جیب میں رکھی آدھی کنڈکٹر کی....اور جس کی بس میں بیٹھے ہیں اس کو کتنا پیسہ دیا؟....سرکار آپ کی خاطر اسی لئے بس چلا رہی ہے....جو لوگ ایمانداری دکھا رہے ہیں وہ آپ کی نظر میں برے ہو گئے.....یہ سب جو ٹکٹ لے کر بیٹھے ہیں برے لوگ ہیں نہ....آپ جیسے اہلِ ایمان اور اس آدمی میں کیا فرق رہ گیا ہے...ان کو تو دیش بھکتی کا سرٹیفکیٹ ملا ہوا ہے...آپ اللہ کے پاس کون سا سرٹیفکیٹ لے کر جائیے گا؟...اور اس بے ایمان کنڈکٹر کو تو میں ٹاٹا

پہنچ کر بتاؤں گا۔''
وہ گم سم مجھے تاکتے رہے۔ کہتے بھی کیا۔ میں نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ جو رکھ دیا تھا۔
جو لوگ بغیر ٹکٹ تھے وہ تو خاموش رہے لیکن بقیہ تقریباً سارے مسافر میری تائید میں کچھ نہ کچھ بولنے لگے۔
''آپ سچ کہہ رہے ہیں....بے ایمانوں کی نظر میں اب ایماندار لوگ ہی برے ہو گئے....سب سرکاری ڈیپارٹمنٹ کا یہی حال ہے....موٹی موٹی تنخواہ ملتی ہے لیکن پیٹ ہے کہ بھرتا ہی نہیں.....بے ایمانی اور کرپشن نے دیش کو کنگال کر دیا ہے.....''
تب تک بس جمشید پور کے اسٹینڈ پر پہنچ چکی تھی۔ اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سارے مسافر اترنے لگے۔ چونکہ میں پچھلی سیٹ پر تھا اس لئے توقف کیا کہ سارے لوگ اتر جائیں تو اطمینان سے اتروں گا۔
نہ جانے کیا سوچ کر کنڈکٹر میرے پاس آیا اور میری دی ہوئی پوری رقم میری طرف اچھال کر غصے میں بھنبھناتا ہوا اتر گیا۔
میں بھی آخر میں اترا اور بس اسٹینڈ کے آفس پہنچا۔ اتفاق سے میرے پرانے شناسا اور اسٹیشن انچارج کمل ورما جی آفس میں بیٹھے مل گئے۔ مجھے دیکھتے ہی بڑے تپاک سے بولے۔'' آیئے آیئے مدنی صاحب.....بڑے دنوں کے بعد درشن دیئے ہیں آپ نے.....آیئے تشریف رکھئے اور کہئے میں آپ کی کیا سیوا کروں۔'' انھوں نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
جب میں بیٹھ گیا تو انھوں نے آفس کے ایک کونے میں اسٹول پر بیٹھے نوجوان سے کہا۔'' مانجھی، ذرا جلدی سے تین چار اچھی سی چائے لے کر آؤ...'' پھر میری طرف رخ کر کے بولے۔'' کچھ اور لیجئے گا مدنی صاحب؟''
''نہیں، صرف چائے۔''

چائے جلد ہی آ گئی۔ چائے پینے کے دوران میں ہی ورما جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔'' ہاں تو فرمایئے....کیسے ادھر بھٹک گئے؟.....کہیں جانا ہے کیا؟....ٹکٹ بنوا دوں؟'' انھوں نے کئی سوال کر ڈالے۔
میں نے کہا۔'' کہیں جانا نہیں ہے.....رانچی سے آ رہا ہوں....بس سے اتر کر سیدھا آپ کے پاس آ رہا ہوں۔''
''اچھا!.....بہت مہربانی کی کہ آپ نے یاد رکھا۔''
''یاد اس لئے رکھا کہ مجھے کمپلینٹ رجسٹر چاہیئے۔''
''خیریت؟'' وہ حیرت سے میرا منھ تکنے لگے۔'' کیا بات ہے مجھے بتایئے۔''
میں نے رانچی سے جمشید پور تک کے سفر کا پورا ماجرا بیان کر دیا۔ سن کر کہنے لگے۔
''کیا بتاؤں مدنی صاحب...ان حرام خوروں کی وجہ سے اسٹیٹ ٹرانسپورٹ بہت گھاٹے میں چل رہا ہے۔ بس کی آمدنی سے کرمچاریوں کی تنخواہ پوری نہیں ہو رہی ہے...چار پانچ مہینے کی آمدنی ہوتی ہے تب جا کر ایک مہینہ کی تنخواہ مل پاتی ہے...آٹھ مہینوں کی تنخواہ باقی ہے۔ اب تو سرکار اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کو بند کرنے کا من بنا چکی ہے۔''
''تب تو میں ضرور اس حرام خور کنڈکٹر کی شکایت درج کروں گا۔''
''جانے دیجئے مدنی صاحب....اس کی نوکری چلی جائے گی.... بال بچے بھوکے مرنے لگیں گے۔'' انھوں نے عاجزی سے کہا۔
چائے ختم کرنے کے بعد میں نے ان سے پھر شکایت رجسٹر طلب کیا۔ لیکن انھوں نے رجسٹر نہیں دیا اور کنڈکٹر کی نوکری، بال بچوں کا حوالہ دے کر سمجھانے کی کوشش کی۔
مانجھی خالی گلاس لے کر باہر جا چکا تھا۔
''اچھا تو اب ان پیسوں کا میں کیا کروں؟''

"اب کیا بتاؤں، جائیے کسی غریب کو دے دیجئے گا۔"

"خوب مشورہ دے رہے ہیں ورما جی آپ.....سرکار کو لوٹ کر غریبوں کی مدد کروں.....مجھے سلطانہ ڈاکو سمجھا ہے۔"

میں دل برداشتہ ہو کر آفس سے باہر آیا۔ سوچنے لگا کہ ٹکٹ کے لوٹائے پیسوں کا کیا کروں؟

میں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ مانجھی نے میرے قریب آ کر پوچھا۔ "رجسٹر دیا ساب؟"

"نہیں دیا۔" میں مختصر سا جواب دے کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ کبھی نہیں دے گا ساب...سب کی ملی بھگت ہے...آپس میں جتنے لوگ ہیں سب کا ہستا (حصہ) لگتا ہے...رجسٹر دے کر اپنے پیر پر کلہاڑی چلائے گا۔"

پورا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ دیش کے لوگ ہی کس طرح دیش کو لوٹ رہے ہیں۔ مگر سوال میری دیش بھکتی اور ایمانداری کا تھا۔ بس کے کرائے کے پیسے مجھے بری طرح کاٹ رہے تھے۔

میں نے ایک عزم کے ساتھ چھ بجے شام کوٹا سے رانچی جانے والی بس کا ایک ٹکٹ خریدا اور پھاڑ کر پھینک دیا۔

☆☆☆☆☆

جس پہ تکیہ تھا

فساد اچانک ہی پھوٹ پڑا تھا۔ اس فساد کی وجہ جنرل ویدیا کے بہیمانہ قتل کی وہ خبر تھی جو ہر اخبار میں نمایاں طور آئی تھی۔ گیارہ بجے دن تک شہر کا تقریباً ہر اخبار بک اسٹال پر آ گیا تھا اور دو بجتے بجتے شہر سے قدرے الگ تھلگ بسی سکھوں کی گرودوارہ بستی پر غنڈوں اور بلوائیوں نے دھاوا بول دیا۔ اس اچانک حملے سے بستی والوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ جس کے جدھر سینگ سمائے بھاگ نکلا۔ بالکل وہی منظر تھا جو تقریباً دو برس قبل اندرا گاندھی کے قتل کے موقع پر نظر آیا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد جب پولس پہنچی تو وہاں ہُو کا عالم تھا۔ ایک بھی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے پٹ، سڑک پر بکھرے ہوئے چھوٹے موٹے سامان، جلتے ہوئے گھر اور گھروں کے اندر باہر بکھری ہوئی انسانی لاشیں خاموشی کی زبان میں اس بربریت کی داستان کہہ رہی تھیں۔

پھر ضابطے کی کارروائی کے تحت سخت کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ اور تین دنوں کے بعد جب کرفیو میں چار گھنٹے کی چھوٹ دی گئی تو بچے ہوئے لوگ اپنی مظلومیت کا منظر دیکھنے کی غرض سے ڈرے سہمے سے پہنچے تھے۔

مہندر سنگھ بھی اپنے گھر اور اثاثے کی خیر و خبر لینے پہنچا تھا۔ یہ تین دن اس نے کارخانے کے اندر ہی گزارے تھے۔ جان بچانے کے لئے کارخانے سے زیادہ مناسب جگہ اور نہیں تھی۔ وہ ٹاٹا اسٹیل میں ملازم تھا۔

دور ہی سے اس کا گھر المناکیوں کی تصویر بنا نظر آ رہا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس کی

بیوی اور بچے فساد سے ایک ہفتہ قبل ہی اپنے آبائی وطن پنجاب چلے گئے تھے ورنہ....

وہ اپنے گھر کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا کہ ان چار پانچ غنڈوں کو دیکھ کر بری طرح چونک پڑا، جو اس کے گھر میں بڑے اطمینان سے چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ پہلی ہی نظر میں پتا چل گیا کہ ایک بھی اہم سامان نہیں بچا ہے۔ اس کے چونکنے کی اصل وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ غنڈے اس کا سامان سمیٹ رہے تھے بلکہ ان کا سرغنہ سنتوش تھا جس سے مہندر سنگھ اچھی طرح واقف تھا اور اس فساد سے قبل اس سے ہمیشہ سلام وکلام ہوتا تھا۔

''سنتوش تم؟'' مہندر کی آواز میں لرزش تھی۔

''ہاں میں!'' سنتوش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''آخر کیوں؟'' مہندر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔

''جنرل ویدیا کی ہتیا کیوں؟'' سنتوش نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے الٹا سوال کیا۔

''اس میں ہمارا کیا دوش؟'' مہندر نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے پوچھا۔

''اور ان کا کیا دوش جنہیں تمہارے بھائی بندھو پنجاب میں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے ہیں۔'' سنتوش بھی ترکی بہ ترکی سوال کر رہا تھا۔ اس کے چاروں ساتھی اس پوزیشن میں تھے کہ موقع ملتے ہی مہندر پر جھپٹ پڑیں۔ ان کی آنکھوں کے تیر مہندر کے جسم میں پیوست ہو رہے تھے۔

مہندر سنگھ ہار سا گیا۔ لیکن دل میں اٹھتی غصے کی لہر کو دبا نہیں سکا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''لیکن تم میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟''

''یار، بات یہ ہے کہ بڑے بڑے سامان تو ہم لوگ لے گئے.... چار گھنٹے کی چھوٹ ملی ہے تو ہم لوگوں نے سوچا، کیوں نہ بچا کھچا بھی صاف کر دیا جائے.... اصل میں مجھے امید نہیں تھی کہ تم اپنے گھر کی خیر خبر لینے پہنچ جاؤ گے.... میں نے تو سمجھا تھا کہ تم بھی گئے کام سے....''

سنتوش نے بے شرمی سے کہا اور اس کے سبھی ساتھی ہنس پڑے۔

''اچھی بات ہے، میں ابھی جا کر رپورٹ کرتا ہوں۔''

''کہاں رپورٹ کرو گے؟'' سنتوش نے مذاق اڑانے کے انداز میں پوچھا۔

''ارے یار مہندر.... تم بھی نرے مورکھ ہو.... تم کو سوچنا چاہئے کہ آخر دنگا ہونے کے دو گھنٹے کے بعد کیوں پولس پہنچی تھی جبکہ تھانہ یہاں سے صرف دو کیلومیٹر کی دوری پر ہے؟''

''کچھ بھی ہو، میں تمہارے خلاف ایف آئی آر ضرور کروں گا۔'' مہندر سنگھ نے اٹل انداز میں کہا۔

سنتوش چڑانے والے انداز میں بولا۔ ''ہاں ہاں، ضرور جاؤ تھانے.... لیکن ایک بات کی جانکاری لے لو شاید تمہارے کام آئے.... وہ یہ کہ تمہارا ٹی وی اور فرج ہم لوگوں نے تھانہ کے بڑا بابو کے یہاں ہی پہنچایا ہے..... ہاہاہاہا...''

☆☆☆☆☆

چالیسواں سنگِ میل

اس نے جب سفر کے چالیسویں سنگِ میل کو پار کر لیا تو، سنہرے بالوں والی دوشیزہ کو حاصل کرنے والے شہزادے کے آنے کی تمام آشاؤں کے دھاگے اچانک ہی تڑتڑا کو ٹوٹ گئے۔

شاید اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ عمرِ عزیز کا کتنا بڑا سرمایہ اس کے انتظار میں ختم ہوگیا۔ اور اب آنکھوں کے سامنے ایک اتنی دبیز اور گہری دھند چھا گئی ہے کہ سامنے کی چیز بھی نظروں کی زد میں آنے سے قاصر ہونے لگی۔ اس دھند کی وجہ سے ایسا لگتا تھا کہ اب آگے کا سفر رک جائے گا، قیدو بند کے تمام ضبط ٹوٹ جائیں گے۔

اے کاش! یہ سفر رک ہی جائے تو غم کا مداوا ہو جائے۔ خدایا! یہ کالی سڑک اور کتنی طویل ہے؟ اب تو پاؤں میں اتنے چھالے پڑ چکے ہیں کہ آگے ایک قدم بھی رکھنا محال ہو رہا ہے۔ یہ سفر تو بغیر ہمسفر کے کتنا دشوار ہے، کتنا کٹھن مرحلہ ہے! اور اب جبکہ اس راہ میں ایک طویل مسافت طے کر چکی ہوں، کوئی میرے ہمراہ چلنے کو تیار نہ ہوا۔ میرے خدا! کیا میں منزل تک تنہا پہنچوں گی؟ سنہرے بالوں والی دوشیزہ کو اپنانے والا وہ شہزادہ جس کی کہانی دادی ماں نے سنائی تھی، کب آئے گا میرے خدا؟

اس نے جب سفر کے آٹھویں سنگِ میل کو پار کیا تھا تو اس وقت دادی ماں نے اس شہزادے کی کہانی سنائی تھی۔

”ایک غریب آدمی کی ایک بہت ہی خوبصورت، پریوں کی طرح بیٹی تھی۔ ایک دن وہ ندی میں نہانے گئی تو نہاتے وقت اس کے کچھ سنہرے بال ٹوٹ کر ندی میں بہہ گئے۔ ادھر سے گھوڑے پر سوار ایک بانکا سجیلا شہزادہ، ندی کے کنارے سیر کرتا ہوا آرہا تھا۔ اس نے جب ان سنہرے بالوں کو دیکھا تو فدا ہوگیا کہ جب بال اتنے خوبصورت ہیں تو بالوں والی کتنی خوبصورت ہوگی۔ چنانچہ اس نے اپنے خادموں سے کہا کہ ان سنہرے بالوں والی حسینہ کا پتا لگا کر آؤ۔ پتا لگ جانے پر اس نے اس لڑکی سے بیاہ رچا لیا اور اس خوبصورت، لیکن غریب دلہن کو ہیروں، جواہرات سے لاد دیا۔ شادی کے بعد لڑکی کے غریب ماں باپ کے بھی دن پھر گئے۔“

اس وقت یہ کہانی اس خوبصورت دوشیزہ کی طرح بس ایک خوبصورت کہانی لگی تھی۔ شہزادے کی اہمیت کا کوئی احساس اس کے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا۔ ہاں! ایک بات ضرور کھٹکتی تھی کہ غریب ماں باپ کی بیٹی سے اس شہزادے نے شادی کیسے کر لی تھی؟ کیوں کہ اسے اپنی باجی کی شادی کے وقت اپنے باپ کے غریب ہونے کا پتا چلا تھا جب عین نکاح کے وقت برات لوٹ کر جانے والی تھی۔ اس وقت اس نے اپنی دادی ماں سے استفسار کیا تھا کہ باجی کی برات واپس کیوں جارہی ہے تو دادی ماں نے امید و ناامیدی کے بیچ ڈوبتے ابھرتے بتایا تھا۔ ”میرے کلیجے کی ٹکڑی، ہم لوگ غریب ہیں نا! غریب کی بیٹیوں کو زندگی کے سفر میں کون اپنا شریک بناتا ہے بغیر مال و متاع کے؟ تمہارے ابو کے پاس تمہاری باجی کے شریکِ سفر کی خدمت میں بھاری مال و متاع پیش کرنے کی استطاعت نہیں ہے۔“

اور جب دادی ماں نے سنہرے بالوں والی لڑکی سے بیاہ رچانے والے شہزادے کی کہانی سنا کر اسے سو جانے کی تلقین کی تھی تو اس نے اچانک پوچھ لیا تھا۔ ”دادی ماں، شہزادے کی شادی میں کتنا مال و متاع ملا تھا؟“

تو انھوں نے بڑے پیار سے کہا تھا۔ ”پگلی، وہ شہزادہ تھا۔ وہ اس لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ محبت کرنے والے کسی کی مجبوری کا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اسے تو اپنے دست

وبازو پر بھروسہ تھا۔ وہ دوسروں کا مال ومتاع لے کر کیا کرتا۔ وہ تو صرف اس خوبصورت لڑکی کا طلبگار تھا۔“

دادی ماں کے اس جواب سے اسے بڑی حیرت ہوئی تھی کہ بغیر مال ومتاع کے اس لڑکی کی شادی کیسے ہوگئی تھی۔ وہ شہزادہ بغیر مال ومتاع کے شادی کرنے پر تیار کیسے ہوگیا تھا؟ اور باجی کی برات بھاری مال ومتاع نہ ملنے کے سبب واپس کیوں جارہی تھی؟

اس وقت اس نے سفر کے صرف آٹھ ہی سنگِ میل پار کئے تھے۔ اس لئے اس معاملے کی تہہ تک پہنچنا اور اپنے سوالوں کے تشفی بخش جواب پاجانا مشکل ہی تھا۔

اور جب اس نے سفر کے سولہویں سنگِ میل کو پیچھے چھوڑا تو اچانک دادی ماں کی سنائی کہانی کا شہزادہ یاد آگیا تھا۔ اور تب اس نے اس کی اہمیت اور اس سے زیادہ اس کی ضرورت کا احساس ہوا تھا۔ راہ میں تنہا سفر کرنے کا احساس اسے بڑی شدت سے ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی کسی کے ساتھ سفر کرنے کا جذبہ بھی کروٹیں لینے لگا تھا۔ سفر کرنے کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ شدید ہوتا گیا تھا۔

سفر کا وہی لمحہ تھا جہاں سے وہ اس شہزادے کا انتظار کرنے لگی تھی کیوں کہ وہی وقت تھا جب اس نے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا تھا اور یہ جان کر مسرت کی ایک تیز لہر اس کے رگ وپے میں سرایت کرگئی تھی کہ اس کے بال بھی سنہرے ہیں۔ اور تب سے وہ اکثر آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے سنہرے بالوں کو نہارتی، بڑی نرمی، ملائمیت اور پیار سے انھیں سنوارتی اور ان کی خوبصورت پر خود فریفتہ ہوجاتی کہ ان ہی بالوں، ایسے ہی بالوں کو پسند کرنے والا کوئی شہزادہ اس کی تلاش میں ہوگا۔

ایک مدت تک اس شہزادے کے، جو کہ اس کے تصور وتخیل، اس کے خوابوں میں رچ بس گیا تھا، انتظار میں وہ خود کو فریب دیتی رہی۔ سانس کے ہر زیر وبم کے ساتھ اس کے ہمراہ سفر کرنے کے سپنے دیکھتی رہی۔ سوتے میں بھی اور جاگتے میں بھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب تک، جبکہ اس نے اتنی طویل مسافت طے کرلی ہے، اس کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے۔

مسافت کے اتنے طویل عرصے میں اسے کئی بار یہ دکھ جھیلنا پڑا تھا کہ زندہ گوشت کھانے والوں گدھوں کی آنکھوں کے زہر بجھے نیزے، اس کے کانچ جیسے شفاف لیکن مکھن جیسے گداز جسم میں پیوست ہوجاتے تو خوف کی ایک موٹی ردا اس کے سراپا سے لپٹ جاتی۔ اور تب اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے۔ سفر کرنا دشوار ہوجاتا اور وہ گھبرا کر راستے کے آگے اور پیچھے دور تک نگاہیں دوڑانے لگتی کہ شاید کوئی ہمسفر بن جانے کو تیار ہوجائے۔ عمر کی تفریق خواہ کتنی ہی ہو۔

والدین نے کون کون سے جتن نہ کئے ہوں گے اس کے ہمسفر کو تلاش کرنے میں۔ لیکن انہیں بھی اپنی کم مائیگی کا احساس آخر ہو ہی گیا تھا۔ وہ بھی چاردانگ میں تلاش سے تھک گئے تھے اور سوچ لیا تھا کہ سب کچھ نیلی چھتری کے مکیں کے حکم سے ہوتا ہے۔ آخر بیچارے کب تک اپنی بیٹی کو کوٹھے پر شام ڈھلے بن سنور کر گاہکوں کو دعوتِ گناہ دینے والی طوائفوں کی طرح، سجا کر، سنوار کر پیش کرتے؟ ہر سجاوٹ پر اس کے ماں باپ کا قد چھوٹا ہوتا گیا تھا اور بہت کچھ کھوتے گئے تھے۔ حوصلہ، امیدیں اور بیٹی کے تئیں اپنے والدین ہونے کا بھرم، بہت کچھ، سب کچھ۔

اور اپنے والدین کی اسی کم مائیگی کو جان کر اس نے کئی بار سوچا تھا کہ اپنے جسم کو، جذبوں کی آنچ میں جلتے بدن کو، تھکن سے چوُر اپنے سراپا کو زندہ گوشت کھانے والے گدھوں کے حوالے کردے تاکہ وہ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کرکے رکھ دیں، جہاں انگ انگ میں درد تھا، تناؤ تھا، ٹیس تھی، سب کچھ ایک ساتھ ختم ہوجائے۔ خود اس کا وجود بھی۔

لیکن پھر اسی شدت سے یہ احساس بھی اسے ہوتا کہ اس کے پاس جو صرف ایک شفاف اور پاکیزہ کانچ ہے وہی چکنا چور ہوجائے گا تو اس کی دوشیزگی کو ثبات کہاں

ہوگا؟ اسی شفاف کانچ کے سوا اس کے پاس اور کیا ہے؟اور پھر اس حالت میں خاندان کی عزت و ناموس اور وقار کا کیا ہوگا؟

مدت تک طویل مسافت کے بعد جب اس نے تیسواں سنگِ میل پار کیا تھا تو وہ جیسے قناعت پسند ہوگئی تھی۔اس نے راستے میں اپنے سے آگے نکل جانے والوں کے بارے میں سوچا تھا۔کاش! یہ کچھ دیر کے لئے رک جائیں تا کہ میں ان کے برابر پہنچ کر کسی کا ہاتھ تھام لوں۔اور بہت پیچھے آنے والوں کے بارے میں بھی سوچا تھا۔ کاش! وہ اتنی تیز رفتاری سے چلیں کہ مجھ تک پہنچ کر اپنے سفر کا شریک بنالیں۔خود اپنے متعلق بھی سوچا تھا کہ خود وہی تھم جائے۔لیکن یہ ایسا سفر تھا کہ چلتے رہنا ہی زندگی کی دلیل تھی۔اس نے اپنے آس پاس چلنے والوں کو دیکھا تھا۔جن میں بہت سے لوگ اپنے ہمسفر کے ساتھ ہنستے گاتے، اٹھکیلیاں کرتے محبتوں میں سرشار چلے جارہے تھے۔لیکن ایک وہ؟ کتنا ناز تھا اسے اپنی سنہری زلفوں پر کہ کوئی نہ کوئی شہزادہ ان زلفوں کا اسیر ہوجائے گا۔

اور اب جبکہ اس نے سفر کے چالیسویں میل کے پتھر کو دیکھ لیا تو سنہرے بالوں والی دوشیزہ کو حاصل کرنے والے شہزادے کے آنے کی تمام آشاؤں کے دھاگے اچانک ہی تڑ تڑا کر ٹوٹ گئے اور یہ ٹوٹن اسے اندر، بہت اندر تک محسوس ہوئی۔شاید وہ خود ٹوٹ گئی تھی۔

اس نے ایک بار پھر اپنے کمرے میں لگے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر اپنے بالوں کو پوری طرح کھول کر ان کا جائزہ لیا اور مایوسیوں کے اتھاہ سمندر میں غرق ہوگئی کیوں کہ اس کے سنہرے بال طویل مسافت کی گرد سے دھندلا گئے تھے۔نہ صرف دھندلا گئے بلکہ ان میں بے شمار چاندی کے تار ایک سرے سے دوسرے تک جھلملانے لگے تھے۔

شہزادہ اب نہیں آئے گا۔اور پھر اچانک ہی اسے لگا کہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی سفر کا اختتام ہوجائے تو بہتر ہے۔

اور دفعتاً اس نے آئینے پر سنہرے بالوں والا سر پوری قوت سے دے مارا۔قد آدم آئینے کی بے شمار کرچیاں، اس کی خوبصورت پیشانی، اس کے خوبصورت چہرے میں پیوست ہوگئیں۔زندگی کا سارا درد یکبارگی اس کے چہرے پر سمٹ آیا۔لہولہان چہرے کو اس نے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔پھر دونوں ہتھیلیوں کو خون آلود دیکھ کر اس نے ایک بھرپور سانس لی۔اور....اور....

تھوڑی دیر بعد گھر والوں نے دیکھا کہ وہ سفر کی تمام صعوبتوں اور قیدو بندِ حیات سے بالکل آزاد ہوچکی ہے۔

☆☆☆☆☆

حق

وہ بڑا ہی بدقسمت تھا۔ سچ بھی ہے، جس کی ماں اسے جننے کے بعد ہی چل بسے، اس بچے سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا؟ اس لئے کہ خدا قسمت بناتا ہے اور ماں اس کی قسمت کی حفاظت کرتی ہے۔ اور اس کی قسمت کی محافظ ماں نہیں تھی اس لئے وہ بد قسمت تھا۔

جب سے اس نے ہوش سنبھالا خود کو ایک بھکاری کا بچہ پایا۔ بچپن کے ابتدائی دنوں میں تو باپ بھیک مانگ مانگ کر اس کا پیٹ بھرتا رہا۔ لیکن باپ کی اچانک موت سے دو وقت کی روکھی سوکھی روٹیوں کا بھی سہارا ختم کر دیا۔

سچ مچ وہ بڑا ہی بدقسمت تھا۔

سچ تو یہ بھی ہے کہ جس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ جائے اسے کون خوش قسمت کہے گا؟ اس لئے کہ خدا رزق دیتا ہے اور باپ اس رزق کے حصول کا ذریعہ۔ جس وقت اس کا باپ اس دنیا سے چل بسا تھا اس وقت اس کی عمر یہی کوئی گیارہ بارہ برس کی رہی ہوگی۔ کچھ دنوں تک تو یوں ہی گزری۔ لیکن جب پیٹ کی آگ نے بے حد پریشان کر دیا تو باپ کے نقش قدم پر چل پڑا۔ اور آج جبکہ وہ بیس بائیس برس کا نوجوان ہو چکا ہے تب بھی اپنے باپ کی تقلید کر رہا ہے۔

ریلوے اسٹیشن کا علاقہ اس کی دنیا تھا اور پلیٹ فارم اس کا گھر۔ دن بھر پلیٹ فارم پر یا اسٹیشن کے باہر بھیک مانگتا اور رات کو پلیٹ فارم کے کسی بھی حصے میں بے خبر سو رہتا۔ کبھی نہانے کی ضرورت ہوئی تو لائنوں کے بیچ لگے ہوئے موٹے پائپ والے نل کے نیچے بیٹھ کر نہا لیتا۔

یہ تو عام طور پر اس کی زندگی کے طور طریقے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اس کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آئے کہ اس نے خودکشی کے متعلق بھی سوچا اور چوری کرنے کا بھی ارادہ کیا۔ اور کبھی کبھی تو ایسا بھی جی چاہا کہ بھیک مانگنے کی بجائے چھین لے۔ اور ایسا خیال اس وقت آتا جب اسے مناسب بھیک نہیں ملتی۔ لیکن وہ آج تک ایسا نہ کر سکا کیونکہ وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ اگر کوئی کسی کا حق نہیں دیتا تو اسے اپنا حق چھین لینا چاہئے۔ اسی لئے وہ دوسروں کی روٹیوں میں اپنا بھی حق سمجھتا تھا۔ کیونکہ اس کی یہ غربت اسی سماج کی دین ہے جس میں وہ ایسی زندگی گزار رہا ہے۔ تھا تو وہ بھکاری لیکن اسٹیشن پر مختلف النوع انسانوں کے تعلقات میں آنے پر اس نے سماج کے اونچ نیچ کو اچھی طرح جان لیا تھا اور حقوق و فرائض کے فلسفے کی تھوڑی بہت سوجھ بوجھ بھی رکھتا تھا۔

کئی برسوں سے وہ اسی اسٹیشن پر بھیک مانگتا آ رہا ہے اس لئے اسٹیشن کے افسران، بابو لوگ، ملازمین، قلی اور پولس والے اسے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے اور وہ اپنی عجیب حرکتوں، فلسفیانہ (یا بے تکی) باتوں کی وجہ سے ان کے درمیان پگلا مشہور ہو گیا تھا۔

آج بھی کچھ ایسا ہی خیال اس کے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا کہ کسی کھانے والے کے سامنے سے اس کا کھانا چھین لے۔ کیونکہ اس نے کل دوپہر سے کچھ کھایا نہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے اتنی دیر تک بھوکا رہنا پڑا تھا۔

انسان جس فعل کو جائز تصور کر لیتا ہے اس کے ارتکاب میں اسے کوئی عار نہیں ہوتا صرف ہمت کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمت اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب آدمی بہت مجبور ہو جائے۔ آج بھوک کی شدت نے اسے مجبور کر دیا تھا۔

سکنڈ کلاس ویٹنگ ہال میں ایک صاحب کاغذ بچھائے پوری اور ترکاری کی

لذتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہورہے تھے۔اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چیل کی طرح جھپٹا اور یہ جا وہ جا۔وہ صاحب ''ارے ارے'' کرتے رہ گئے۔مسافروں کے درمیان'' پکڑو پکڑو، مارو مارو'' کا ایک غلغلہ بلند ہوا۔لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ''پگلا'' تھا جو کچھ چرا کر یا لوٹ کر نہیں بلکہ کھانا چھین کر بھاگا ہے تو لوگ شانت ہوگئے۔

کافی دور جا کر وہ رکا اور جب اس نے دیکھ لیا کہ اس جرم کی سزا دینے کے لئے آس پاس کوئی نہیں ہے تو وہ وہی کاغذ پھیلا کر کھانے بیٹھ گیا جسے کھانے کے ساتھ چھینا تھا۔پوری کا پہلا لقمہ توڑ کر منہ میں ڈالا ہی تھا کہ اس کے سامنے سے کاغذ سمیت روٹیا ں غائب ہوگئیں۔وہ چونک پڑا، منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔اس نے دیکھا کہ میلے کچیلے چیتھڑوں میں ملبوس ایک دوسرا نوجوان اس کی چھینی ہوئی پوریاں لئے بھاگا جارہا ہے۔

میں کافی دیر سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔تھوڑی دیر بعد جب وہ پھر پلیٹ فارم پر آیا تو اس کے چہرے پر اداسی اور تاسف کی بجائے ایک طرح کی آسودگی نظر آرہی تھی۔

میں ٹکٹ کلکٹر کی حیثیت سے اس پگلے سے اچھی طرح واقف تھا۔اس لئے میں نے ہنستے ہوئے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔''کیوں بے پگلے .....تو دوسرے کا کھانا چھین کر بھاگا تھا.....اور تیرا کھانا کوئی اور لے بھاگا.....کیسا لگا؟''

اس نے بڑی متانت سے جواب دیا۔''ہاں بابوساب.....وہ چھین کر لے گیا تو کا گلت کیا.....ہم چھینا تھا تواؤ ہمارا ہک (حق) تھا.....اوچھین کر لے گیا تواؤ اس کا ہک تھا۔''

☆☆☆☆☆

پردھان جی

پردھان جی اس رات بھی اپنے معتمد کے ساتھ گاؤں میں گشت لگا رہے تھے۔ راتوں کو گشت کرنے کا سلسلہ انہوں نے اس رات سے شروع کیا تھا، جس دن گاؤں میں ہوئے مسلمانوں کے ایک مذہبی جلسے میں واعظ کے خطاب میں خلیفۃ المسلمین کا ایک واقعہ سنا تھا، جو راتوں کو گشت کرکے عوام کی پریشانیوں اور مسائل کی جانکاری حاصل کرتے تھے۔خلیفہ کے اس عمل سے شنکر پورا گاؤں کے پردھان بہت متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بھی، روزانہ نہ سہی لیکن کم از کم ہفتے میں ایک بار ضرور رات میں گھوم گھوم کر گاؤں کے لوگوں کی پریشانیوں اور مصیبتوں کی صحیح جانکاری حاصل کرکے، اپنے منصب اور اپنی استطاعت کے مطابق انہیں دور کرنے کی کوشش کریں گے۔آخر وہ بھی تو ایک طرح سے گاؤں والوں کے خلیفہ تھے۔استعمال میں الفاظ بدل گئے ہیں مگر مفہوم تو وہی ہے۔اور پھر اس طرح وہ اپنے خلاف ہونے والی سازشوں اور سماج دشمن عناصر کا بھی تو پتا لگا سکتے ہیں۔

اور انہوں نے اپنے معتمد خاص کے ساتھ گشت لگانے کا سلسلہ شروع کردیا۔

اس رات بھی وہ اپنے معتمد کے ساتھ گاؤں کا گشت لگا رہے تھے کہ اچانک ایک جھونپڑی نما گھر کی کھڑکی سے ایک بوڑھی عورت اور کسی جوان لڑکی کی آوازیں سن کر رک گئے اور دم سادھے کھڑکی کے نیچے کھڑے اندر کی گفتگو سننے لگے۔

گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ وہ بوڑھیا بیوگی کی زندگی گزار رہی ہے۔کوئی دستگیری کرنے والا نہیں ہے۔بڑھیا چند گھروں میں برتن مانجھ کر اپنی بیٹی کی پرورش کررہی

ہے۔گاؤں کا پردھان بھی غریبوں کا پرسان حال نہیں ہے....وہ تو صرف اپنے عزیز و اقارب اور اہل کاروں کی سنتا ہے....گاؤں کی جنتا تو پردھان کی اولاد کی ہوتی ہے....اسے تو گاؤں کے ہرفرد کے دکھ درد کی جانکاری رکھنا چاہئے۔وغیرہ وغیرہ۔

اب اپنے خلاف ایسی باتیں سننے کی تاب ان میں نہیں تھی۔اپنے معتمد کے ساتھ اس گھر کے دروازے پہنچ کر انہوں نے دستک دی۔ بڑھیا نے اتنی رات گئے دستک سن کر ڈری سہمی آواز میں پوچھا۔''کون؟''

معتمد نے کہا۔''پردھان جی ہیں....دروازہ کھولو۔''

بڑھیا نے دروازہ کھولا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے انہیں اندر بلا لیا۔دونوں نے اندر پہنچ کر دیکھا کہ ایک جوان ،خوبصورت سی لڑکی سہمی سمٹی کھڑی نو واردوں کو گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھے جا رہی ہے۔اس کی آنکھوں میں یاسیت اور چہرے پر غربت کا کرب تھا۔

پردھان جی کو دیکھتے ہی بڑھیا گڑگڑانے لگی۔'' معافی چاہتی ہوں پردھان جی....میں پاگل ہوگئی ہوں....بڑھاپے نے میری مت ماردی ہے....آپ کے خلاف جو کچھ بھی کہا ہے وہ میرا پاگل پن ہے....''

پردھان جی اپنائیت سے بولے۔'' نہیں نہیں ....کوئی بات نہیں....ہمارے خلاف آپ کو بولنے کا پورا حق حاصل ہے....ہمیں افسوس ہے کہ ہماری پردھانی میں آپ کو تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے....دراصل اتنے بڑے گاؤں میں ہر ایک کے انفرادی حالات کی جانکاری حاصل کرنا بہت مشکل ہے جب تک کہ ہمارے کاریالے میں عرضی نہ دی جائے....پھر بھی ہم اپنی کوتاہیوں پر شرمندہ ہیں....بتایئے ہم آپ کی کیا سیوا کر سکتے ہیں؟''

اپنائیت کے یہ میٹھے بول سن کر بڑھیا نے اپنی غربت کا دفتر کھول دیا۔'' آپ کی عمر لمبی ہو پردھان جی....میں ایک بیوہ عورت ہوں ....کوئی کمانے والا نہیں ہے....میری بس یہی ایک لڑکی ہے ....میں اس کی شادی کو لے کر پریشان ہوں ....دوچار گھروں میں برتن مانجھ کر بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی جٹا پاتی ہوں....تلک جہیز کی رقم کہاں سے لاؤں....میں نے پیٹ کاٹ کاٹ کر اسے کسی صورت میٹرک تک پڑھایا ہے لیکن اب آگے....''

پردھان جی بڑھیا کے دکھ بھرے حالات سے بہت متاثر ہوئے۔

انہوں نے کہا۔''ماں جی !....آپ چنتا نہ کریں ....دھنیہ ہے آپ کی بیٹی کہ میٹرک پاس ہے....میں اپنی کوشش سے اسے شہر میں کسی دفتر میں نوکری دلا دوں گا....فی الحال دس ہزار روپئے کا بندوبست کر دے رہا ہوں۔''

پھر اپنے معتمد سے کہا۔''ماں جی کو کاریالے لے جا کر میری طرف سے دس ہزار نقد دے دو....پھر انہیں یہاں تک پہنچا دینا۔''

''اتنی رات گئے؟'' بڑھیا نے تشویش کا اظہار کیا۔

'' ارے ماں جی، اپنا کاریالے ہے ...رات برات کیا....وہاں آپ کو کاغذ پر انگوٹھا بھی تو لگانا ہے....یہ سب ضروری کارروائی ہے....''

بڑھیا پردھان جی کے اس احسان تلے دب گئی۔اس نے ایک نظر اپنی بیٹی پر ڈالی، پھر پردھان جی کو دیکھا۔تھوڑی دیر تک کچھ سوچا اور پھر پردھان جی کے معتمد کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی۔ کیونکہ اس کے سامنے بیٹی کا مستقبل تھا، اپنی المناک زندگی تھی، کچھ سنہری خواب تھے اور ایسی مجبوریاں تھیں جو انسان کی عقل سلب کر لیتی ہیں۔

بڑھیا معتمد کے ساتھ چلی گئی اور پردھان جی نے اندر سے دروازے کی کنڈی لگالی۔

☆☆☆☆☆

ٹوٹی کہاں کمند

جموا نے بھوک سے پیدا شدہ پیٹ کی آگ کو سرکاری نل سے ڈھیر سا پانی پی کر بجھایا اور میلے آستین سے ہونٹوں کو خشک کر کے ایک سرد آہ بھری۔ ہونٹوں سے ایک لفظ آزاد ہو کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ ''باپو!''

زبان پر باپو کا نام آتے ہی خیالات کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا۔ ''کہاں سے لاؤں روپیہ باپو.... کینسر ہو گیا ہے.... یہ سالا کینسر غریبوں کو کیوں ہو جاتا ہے.... باپ رے ایک لاکھ روپیہ.... ایک لاکھ روپیہ تو ہم لوگوں نے سپنے میں بھی نہیں دیکھا ہے.... ایک لاکھ تو دور رہا آج تک تو ایک ہزار کا نوٹ چھوکر بھی نہیں دیکھا ہے.... ایک لاکھ تو آپریشن کا خرچ ہے باقی دوسرے اخراجات الگ....''

پھر ذہن میں ایک آواز گونجنے لگی۔ ''دیکھو، یہ بڑا خطرناک مرض ہے ....وہ پھیپھڑا کاٹ کر نکال دینا ہوگا.... دیر ہو جانے سے کہیں دوسرے پھیپھڑے میں نہ پہنچ جائے.... خرچہ بہت آئے گا.... جتنی جلدی ہو سکے پیسوں کا انتظام کر لو....'' یہ کانتی لال اسپتال کے ڈاکٹر کی آواز تھی۔

''اس ڈاکٹر کو کیا معلوم کہ دو وقت کی روٹی کا انتظام کتنی مشکلوں سے ہوتا ہے۔ صبح کو کھا لیا تو رات کا انتظام.... آج مل گئی تو کل کی تلاش.... ایک لاکھ روپیہ.... کس سے فریاد کی جائے.... غریبوں کی کون سنتا ہے.... کوئی قرض بھی دینے کو تیار نہیں.... آخر کوئی کس بھروسے پر قرض دے گا.... رہن رکھنے کے لئے کوئی زیور نہیں.... سود بھرنے کی ہمت نہیں.... پھر؟.... چوری؟.... باپ رے بھگوان بچائے.... کتنا ذلیل کام ہے.... آخر انسانی غیرت بھی کوئی چیز ہے.... کیا ہوا اگر غریب ہیں تو.... دوسروں کا لوٹ کھسوٹ کر اپنا پیٹ بھرنا یہ تو جانوروں کا کام ہے.... نہیں نہیں چوری تو ہرگز نہیں کریں گے.... پھر؟

جموا کا باپ جگجیون رام عرف جگوا ایک خاندانی موچی ہے۔ جب تک اس کے قویٰ مضبوط تھے، وہ صبح سے شام تک فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لوگوں کی جوتیاں گانٹھا کرتا یا پالش کرتا تھا۔ دن بھر پیہم محنت کے بعد جو کچھ پچاس ساٹھ روپے ملتے تھے ان سے وہ اپنے بال بچوں کے لئے روٹیوں کا انتظام کرتا تھا۔ مگر ضعیف العمری نے مجبور کر دیا کہ اب وہ اس کام کو چھوڑ دے۔ چنانچہ اس کی جگہ جموا کو لینا پڑی۔ جموا بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس سے دو چھوٹی بہنیں تھیں، جو شادی کے لائق ہو چکی تھیں۔ جموا کا باپ ہمیشہ بیمار رہنے لگا جس سے اور بھی مالی پریشانی رہنے لگی۔ پہلے تین وقت کی روٹی آرام سے مل جاتی تھی لیکن اب تو دو وقت کی روٹیوں کے بھی لالے پڑے ہوئے تھے۔ اور پھر نہ جانے کیسے اس کا باپ کھانستے کھانستے، بلغم تھوکتے ہوئے کینسر کا شکار ہو گیا۔ اور پھر اس موذی مرض نے تو ایک وقت کی روٹی کا سہارا بھی چھین لیا۔ ماں جو محلے میں مہذب گھرانوں میں زچگی کے معاملات میں مدد کرتی تھی، اس دنیا سے چار پانچ برس قبل ہی چل بسی تھی۔ جموا اپنی بہنوں کو دائی، آیا بنا سکتا تھا لیکن اس کم عمری میں ہی وہ زمانے کی روش سے خوب واقف ہو چکا تھا۔

خیالات نے ایک بار پھر حملہ کر دیا۔ ''باپو کا بچنا بہت ضروری ہے.... ماں تو بیٹیوں کی شادی اور ہمارے سہرے کی تمنا لے کر ہی دنیا سے چلی گئی.... اب اگر باپو بھی؟..... نہیں نہیں.... باپو کی کتنی تمنا ہے کہ بچوں کی شادی ہو جائے.... زندگی بھر اسی آسرے پر لوگوں کی جوتیاں گانٹھتے رہے.... ہر ہر طرح سے ہم لوگوں کی پرورش کی .... کبھی بھوکا نہیں رکھا.... ہے بھگوان، کہیں سے لاکھ روپئے مل جاتے....

بھوک سے ایک بار پھر انتڑیاں اینٹھنے لگیں۔ ایک ٹیس کلیجے میں اتر رہی تھی۔ اس

نے میلی پتلون کی جیب میں پڑے دن بھر کی جان توڑ محنت کے عوض ملے پیسوں کو ٹٹولا۔ دل مسوس کر رہ گیا۔ کیونکہ اسے اس بات کا خیال تھا کہ دونوں بہنیں دن بھر کی بھوکی ہوں گی۔ آج اس نے بھی صبح کو کچھ نہیں کھایا تھا کیونکہ گھر میں پکانے کو کچھ تھا ہی نہیں اور پیسے بھی نہیں تھے۔ دوپہر کو کھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اس وقت وہ اپنی دکان بند کر کے آ رہا تھا۔ بازار کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ رنگ و نور کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ مگر اس کے لئے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اچانک اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔ ”آیئے، آپ بھی اپنی قسمت آزمایئے... کون جانے آپ کی تقدیر کھل جائے.... ہوسکتا ہے دس لاکھ کا پہلا انعام آپ کا ہی نکل جائے.... پھر تو آپ گڈی کے گڈی، بنڈل کے بنڈل.... ہرّا ہرّا، کرّا کرّا نوٹوں کے مالک ہوں گے.... اسٹیٹ لاٹری کا ڈرا پرسوں ہی ہونے والا ہے.... بس دو دن اور رہ گئے ہیں.... قسمت آزمایئے....“

یہ اعلان سن کر وہ چونک پڑا۔ آنسو پونچھ کر اس نے نظر اٹھائی۔ لاٹری والی کار کے اوپر لگے بورڈ پر بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا:...... راجیہ لاٹری۔ اور کار میں بیٹھا ہوا ایجنٹ لکھ پتی بننے کی دعوت دے رہا تھا۔

یکایک اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوگئی۔ اس نے سوچا، کیوں نہ میں بھی ٹکٹ خرید لوں۔ اس نے بڑی حسرت سے جیب کی کل رقم کو مد نظر رکھا۔ ”اگر ٹکٹ خرید لوں تو رات کے کھانے کا کیا ہوگا؟.... ہوں.... ایسا کرتے ہیں کہ صرف دو ہی ٹکٹ خرید لیں.... ہوسکتا ہے کوئی انعام نکل ہی آئے.... باقی پیسے گھر کے خرچ کے لئے رکھ لیتے ہیں“

اس نے ایجنٹ سے دو ٹکٹ خریدے اور جیب سے دس روپئے نکال کر ادا کئے۔ ٹکٹوں کو بہت احتیاط سے جیب میں رکھا۔ اب اسے بہت خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی جیب میں لاٹری کے ٹکٹ کی بجائے لاٹری میں نکلی انعامی رقم ہو۔ مسرت کا جذبہ لئے وہ گھر پہنچا۔ باپ کو تسلی دی کہ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں.... جلد ہی انتظام ہو جائے گا۔ گویا اسے یقین تھا کہ لاٹری میں انعام ضرور نکلے گا۔ اس کے باپ نے بہت ہی یاس انگیز لہجے میں کہا۔ ”رہنے دے بیٹا پیسے ویسے کا انجام.... بہت دن جی لئے.... بس ایک تمنا تھی کہ تمہاری اور بیٹیوں کا بیاہ دیکھ لیتے تو آتما کو چین پڑ جاتا... نہیں تو پرلوک میں تمہاری ماں کو کیا منھ دکھائیں گے؟“

اور پھر اس کا باپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جموا کو لاٹری میں انعام نکل جانے کی امید سے رات میں بہت دیر سے نیند آئی۔ عجیب عجیب سے پروگرام بناتا اور بگاڑتا رہا۔ کبھی کبھی بڑ بڑا اٹھتا۔ ”اب باپو اچھے ہو جائیں گے۔“

صبح وہ بہت جلد اٹھ گیا۔ اسنان کر کے مندر جا پہنچا۔ زندگی میں شاید پہلی بار وہ مندر آیا تھا۔ مندر کی پہلی سیڑھی پر، جہاں سارے لوگ جوتے چپل اتارتے ہیں، بیٹھ گیا۔ اندر جانے کی ہمت نہیں پڑی کیونکہ اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ایک چمار مندر میں گھس گیا ہے تو ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا، ہوسکتا ہے اس کی جان کے لالے پڑ جائیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر ونتی کرنے لگا۔ ”اے بھگوان، ہم نے کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانگا.... آج پہلی بار اپنے باپو کے جیون کی بھیک تجھ سے مانگنے آئے ہیں.... لاٹری کا کوئی بھی انام (انعام) ہمارے نام نکال دے.... اے پربھو، تیرے لئے یہ کوئی مسکل (مشکل) نہیں..“

محبت اور عقیدت سے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ کافی دیر تک وہ بھگوان سے لاٹری نکلنے کی دعا کرتا رہا۔

پھر تو اس کا روزانہ کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ صبح مندر جاتا، بھگوان سے لاٹری میں انعام نکلنے کی دعا مانگتا اور شام کو اپنی دکان سے لوٹتے وقت لاٹری کے ایجنٹ سے نتیجہ

کے بارے میں پوچھتا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ نتیجہ ایک ہفتہ کے بعد ہی معلوم ہوگا۔ لیکن دل کو تسلی دینے کے لئے پوچھ لیا کرتا تھا۔

ساتویں دن جب وہ اپنی چھوٹی سی دکان بڑھا کر آ رہا تھا تو لاٹری کے ایجنٹ کا یہ اعلان سن کر اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ ''آپ کے شہر میں......راجیہ لاٹری کا دو لاکھ کا دوسرا انعام نکلا ہے۔'' یہ جملہ وہ بار بار دہرا رہا تھا۔

اس نے جیب سے کاغذ کا وہ پرزہ نکالا جس پر اس نے لاٹری کا نمبر نوٹ کر رکھا تھا۔ یہ بات اس کے ایک ساتھی نے بتائی تھی کہ رزلٹ دیکھنے کے لئے ٹکٹ لے کر مت جانا....اس کا نمبر کسی کاغذ پر نوٹ کر لینا....ہو سکے تو ٹکٹ کی فوٹو کاپی لے کر جانا اور نمبر ملانا۔

اس نے وہ پرزہ لاٹری کے ایجنٹ کو دے کر کہا۔ ''بھیا، جرا دیکھئے تو....اس نمبر پر کوئی اِنام نکلا ہے؟''

ایجنٹ نے وہ پرزہ لے اخبار میں چھپے لاٹری کے نتیجے سے ملان کرانے لگا۔ اچانک وہ تقریباً چیخ پڑا۔ ''ارے، دوسرا پرسکار تو آپ ہی کا ہے۔''

جموا کا دل جیسے حلق میں آ کر اٹک گیا۔ مارے خوشی کے اس کے منھ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے تو اس نے ایجنٹ سے انعامی رقم حاصل کرنے کی ساری تفصیلات معلوم کیں۔

جمنا رام عرف جموا کے قدم زمین پر ٹھیک سے نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ''کیا یہ سچ ہے؟....کیا غریبوں کا بھی انعام نکل سکتا ہے؟''

اب وہ جلد از جلد گھر پہنچ کر باپو کو خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔ اب تو ساری پریشانی دور ہو جائے گی....باپو اچھے ہو جائیں گے....روپا....پارو کی شادی خوب دھوم دھام سے کروں گا....اب ہم جوتے گانٹھنے کی بجائے کوئی اور بزنس کریں گے....اے بھگوان، تیرا دھنیہ واد....سچ میں تیرے گھر دیر ہے اندھیر نہیں...

جب وہ گھر پہنچا تو اس کے باپو بستر پر پڑے کراہ رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح یہ خوشخبری باپو کو سنائے۔ پھر کچھ سوچ کر وہ خاموش رہا۔ اس وقت بتانا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔ رقم حاصل ہو جانے کے بعد ہی بتانا ٹھیک رہے گا۔

تین دنوں تک اس نے دکان نہیں کھولی۔ اس دوران میں بینک کے توسط سے انعامی رقم حاصل کرنے کی تگ و دو اور کاغذی کارروائی میں لگا رہا۔

تیسرے دن تقریباً گیارہ بجے وہ ہاتھ میں ایک میلا کچیلا تھیلا لٹکائے گھر پہنچا اور باپو کے بستر کے پاس پہنچ کر بڑے پر سکون لہجے میں بولا۔'' باپو....گھبرانا نہیں..تمہارے اپریسن کے لئے ہم انتجام کر لئے ہیں....دو لاکھ روپیا....''

''دو لاکھ؟'' اس کے باپو نے حیرت سے کہا۔'' کاہے مجاک (مذاق) کر تے ہو بیٹا؟''

''سچ کہتے ہیں باپو....ای دیکھو....لاٹری میں اِنام نکلا ہے....تم کو ہم پہلے نہیں بتائے تھے۔'' کہہ کر جموا نے باپو کی گود میں تھیلا الٹ دیا۔

اتنے سارے نوٹ ایک ساتھ دیکھ کر جگ جیون کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ جموا نے غور سے دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

غریب جگ جیون رام، جو زندگی بھر سو روپئے پانے کا تصور نہیں کر سکتا تھا، اکٹھے دو لاکھ روپئے پانے کی خوشی کو برداشت نہ کر سکا۔ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

تیسرا طوفان

سدھیر نے جب بی اے پارٹ ون میں داخلہ لیا تو سب سے پہلے کالج میں جس شخصیت نے اسے متاثر کیا وہ سداما کی تھی۔

وہ ایک بھرپور اور مکمل دوشیزہ تھی۔ شہابی رنگت، چشمِ مے آگیں، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، بھرے بھرے شفق گوں رخسار، شباب کا امڈتا چڑھتا دریا، کالے لمبے بال اور اس پر لباس کا انتخاب اس قدر عمدہ کہ نظر پڑے تو ہٹنے کا نام نہ لے۔ اس کے حسن اور نفاست نے اسے کالج کی حسیناؤں میں ایک انفرادیت عطا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کلاس کی بھی روحِ رواں تھی۔ پروفیسروں سے کبھی کبھی ایسے پیچیدہ سوالات کر بیٹھتی کہ پروفیسر حضرات بغلیں جھانکنے لگے۔ مگر کیا مجال کہ کالج کا کوئی شریر سے شریر لڑکا اسے چھیڑ دے۔ ویسے وہ سبھی طلبہ و طالبات سے خندہ پیشانی سے ملتی، ان کے دکھ سکھ میں کام آتی۔ اس کی سرشت میں غرور نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا اندازِ گفتگو اتنا شیریں، شائستہ اور دل لبھانے والا ہوتا کہ دل میں ایک عجیب سی گدگدی، ایک میٹھی سی چبھن کروٹیں لینے لگتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ کلاس کا ہر لڑکا دل ہی دل میں اس کی پوجا کیا کرتا تھا۔

سداما، سدھیر کی کلاس فیلو تھی۔ دونوں کا ہی مین سبجکٹ نفسیات تھی۔ چونکہ سدھیر کا شمار بھی ذہین طلبہ میں ہوتا تھا، اس لئے ان دونوں کی دوستی بالکل فطری تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور اپنے اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے ایک مخصوص طرح کا احترام بھی رکھتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد سدھیر نے محسوس کیا کہ وہ اسے دوسرے لڑکوں پر ہر معاملے میں فوقیت دیتی ہے۔ سدھیر بھی اس کی جانب کھنچنے لگا۔ رفتہ رفتہ دوستی کی بنیادیں گہری ہوتی گئیں۔ اور پھر ان کی دوستی محبت میں بدل گئی۔ مگر انہوں نے اپنی محبت کو ہر ایک سے پوشیدہ رکھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی پاکیزہ محبت کالج کے کاریڈور میں گفتگو کا موضوع بنے۔ محبت پروان چڑھتی گئی۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے عہد و پیمان ہوتے رہے۔ ہوٹل اور تفریح گاہیں ان کی محبت کی گواہ بنتی رہیں۔

سداما ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ماں باپ بقیدِ حیات تھے۔ وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس سے چھوٹی ایک بہن اور دو بھائی تھے جو سب کے سب اسی کی طرح زیرِ تعلیم تھے۔ اس کے پتا ایک معمولی مزدور تھے جن کی تنخواہ بہ مشکل دس بارہ ہزار روپئے ماہانہ تھی۔ مگر سداما جس ٹھاٹ باٹ سے اور جسم قسم کا لباس پہن کر کالج آتی تھی، اس سے یہی گمان ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑے گھر کی بیٹی ہو۔ ایسی آسمان چھوتی گرانی اور اتنی معمولی آمدنی میں پریوار کا خرچ ہی چلنا مشکل لگتا ہے۔ پھر بھلا ایسے قیمتی لباس کی گنجائش کہاں سے پیدا کی جاتی ہوگی؟ یہ سوال سدھیر کے ذہن میں الجھن بن گیا تھا۔ آخر ایک دن وہ پوچھ ہی بیٹھا تو کہنے لگی۔ ”سدھیر صاحب، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس قسم کا لباس پہن کر خوش ہوتی ہوں؟ نہیں، ہرگز نہیں، یہ تو ایک خول ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لئے میں نے اپنے اطراف منڈھ رکھا ہے، مگر اس کے اندر کتنا کھوکھلا پن ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔ غریب اگر غربت کا اظہار کرتا ہے تو سماج اس کی غربت کا مذاق اڑانے پر تل جاتا ہے۔ یہ لباس تو میں کالج کے ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کے لئے پہنتی ہوں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ایسے لباس کو فراہم کرنے کے لئے ہمارے پریوار کو آدھا پیٹ کھانا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو میرے پتا جی کو سود پر قرض لینا پڑتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی غربت اور افلاس کی سیاہ پرچھائیاں کہیں کالج میں مجھے مذاق کا

موضوع نہ بنا دے، مجھے کمتر نہ سمجھا جانے لگے۔"

اور یہ کہتے کہتے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ سدھیر نے سوچا، سداما واقعی سچ کہتی ہے، ہمارے ماحول کی نگاہیں لباس کے آگے دیکھنے کی اہل ہی نہیں ہیں۔

سداما کے گھریلو حالات سے واقف ہونے کے بعد سدھیر اس کا اور زیادہ گرویدہ ہو گیا تھا۔ کتنی بہادر ہے کہ وہ شعلوں میں مسلسل جل رہی ہے اور زبان سے اف تک نہیں کرتی کہ کہیں یہ کور چشم سماج اس کی زندگی کا کرب دیکھ نہ لے۔

جوبلی پارک بڑی حسین جگہ ہے۔ اتوار کے دن تو پارک کی رونقیں شباب پر ہوتی ہیں۔ شام ہوتے ہی عورتوں، مردوں، بوڑھوں، بچوں کی آمد کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ چند ہی گھنٹوں کے لئے ہی سہی لوگ سب کچھ بھول بھال کر یہاں کی رنگینیوں میں کھو جاتے ہیں۔ دلفریب مناظر ان میں زندگی کا نیا عزم، نیا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی زینہ دار نہریں اور ان میں بہتے ہوئے پانی کی نیچے رنگ برنگے برقی قمقمے روشن ہو جاتے ہیں۔ نہروں کے بیچو بیچ چھوٹے چھوٹے چکر دار فوارے، جن کی بوچھار میں نوجوان جوڑے اپنے چہروں کو بھگو کر خوب ہنسی ٹھٹھول کرتے ہیں۔ دور دور تک سبزے کی مخمل بچھی ہوئی، انواع و اقسام کے پھولوں سے معطر فضا، مختلف درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوائیں اور پارک کی شمالی جانب پرسکون چاندی جیسی جھیل جس میں کنول کے بے شمار پھول اور مرغابیوں کے تیرتے جھنڈ۔ اس جھیل کے ٹھیک وسط میں آسمان سے باتیں کرتا ہوا فوارہ۔ غرض جدھر نظر ڈالئے، آنکھوں کو ٹھنڈک، دل کو فرحت، ذہن کو راحت و آسودگی کے ہزاروں سامان ہیں جو جوبلی پارک نے اپنے جلو میں جمع کر رکھے ہیں۔

وہ اتوار ہی کی ایک شام تھی۔ سدھیر اور سداما پارک کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ٹہلتے گھومتے جب تھکن سی محسوس ہونے لگی تو سب سے الگ تھلگ پھولوں کے ایک کنج میں جہاں درختوں کے ہجوم نے اندھیرا سا کر رکھا تھا، ستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ سدھیر پارک میں بنے ایک پتھریلے بنچ کی پشت سے پیٹھ ٹکائے بیٹھ گیا۔ سداما نے اپنا سر اس کے زانو پر رکھ کر بنچ پر لیٹ گئی۔ وہ کنج سے جھانکتے ہوئے آسمان میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ مگر سدھیر اس کے خوبصورت چہرے اور جسم کے نشیب و فراز میں کھو گیا تھا۔ دونوں کافی دیر تک چپ چاپ اپنے آپ میں کھوئے کھوئے رہے۔

اس طرح آسمان میں کیا دیکھ رہی ہو سداما؟" سدھیر نے اچانک پوچھ لیا۔

"دیکھ رہی ہوں آج چاند کچھ زیادہ ہی دلکش نظر آ رہا ہے۔ لگتا ہے جیسے کوئی معصوم چہرہ ہو، مگر کہیں انسانوں کے لالچی قدم اس کے حسن اور معصومیت کو داغدار نہ کر دیں۔"

"تمہارا چاند تو داغدار ہو چکا ہے سداما! لیکن میرے پاس جو چاند ہے وہ بالکل بے داغ اور تمہارے چاند سے کہیں زیادہ حسین اور روشن ہے۔ اتنا روشن کہ میری زندگی کی تاریک راہیں روشن ہو چکی ہیں۔" سدھیر نے اس کی زلفوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ سداما شرما گئی۔

پھر سدھیر کا ہاتھ زلفوں سے گزرتا ہوا اس کے رخسار، اس کے شانوں اور اس کے جسم کے نشیب و فراز پر پھسلنے لگا۔ تنہائی، نیم روشن کنج، شرابی موج ہوا اور دلفریب مناظر نے ان کے دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کر دیا تھا۔ وہ دونوں دلفریبیوں کے سبک موجوں میں بہنے لگے۔ بالآخر ان کے لرزتے، جلتے ہونٹوں نے ایک دوسرے کو تلاش کر لیا۔ نہ چاہنے پر بھی انہیں یہ سیلاب بہا لے گیا۔ پھر جب سیلاب کا زور تھما تو سدھیر کا چاند بھی آسمان کے چاند کی طرح داغدار ہو چکا تھا۔

طوفان آیا اور گزر گیا مگر احساسِ ندامت کی شدت سے وہ ایک دوسرے سے نظریں چرائے چل رہے تھے۔ جب سداما اس کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی تو اپنا سر اس کے شانے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ سداما سے معافی مانگتا رہا۔ اسے

اپنے کمزور وجود سے نفرت سی ہونے لگی۔

دوسرے دن جب سدھیر کالج پہنچا تو سوچا شاید وہ سداما کو ہمیشہ کے لئے کھو چکا ہے۔ سداما کو اس کا حق بھی تو تھا کہ وہ اس سے نفرت کرے جس نے اس کی متاعِ دوشیزگی چھین لی تھی۔ مگر سداما کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کتنی عظیم ہے وہ جس نے میرے جیسے گندے انسان کو معاف کر دیا تھا۔ سدھیر نے سوچا۔ اس کے دل میں سداما کے لئے عقیدت سی پیدا ہو گئی تھی۔

اس طرح دو ماہ بیت گئے۔ ایک دن سداما نے سدھیر سے اکیلے میں ملاقات کی۔ اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔ سداما نے کہا۔'' سدھیر، میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

اس خبر سے سدھیر کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ وہ اسے صرف دیکھتا رہا۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

سداما کہنے لگی۔'' میں نے بھی کبھی ایسے خواب دیکھے تھے، میری بھی تمنا تھی کہ میں تمہارے بچے کی ماں بنوں اور فخر سے تمہارے بچے کو سینے سے لگائے دنیا کے سامنے اپنے آپ کو سر بلند محسوس کروں۔ مگر سدھیر، کیا تمہارا یہ بچہ مجھے سر بلندی عطا کر سکے گا یا.....''

''نہیں نہیں....'' سدھیر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔'' ایسا نہ کہو سداما، یہ بچہ نہیں میری ہوس کا ناگ ہے جو تمہاری نیک نامی، تمہارے مستقبل بلکہ تمہارے پریوار کو ڈس لے گا.....اس کا سر کچل دو سداما.....بھگوان کے لئے اس سنپولے کا سر کچل دو.....''

''میں نے ایک لیڈی ڈاکٹر سے بات کی ہے مگر وہ اس کے لئے پانچ ہزار روپے مانگتی ہے۔''

''اور تم جانتی ہو کہ تمہاری عزت کے سامنے پانچ ہزار کیا پانچ لاکھ بلکہ میں اپنی زندگی دے کر بھی تمہاری عزت بچا سکوں تو دریغ نہیں کروں گا۔''

اور اس نے اسی وقت پانچ ہزار روپئے کا چیک سداما کے نام سے کاٹ کر اسے دے دیا۔

سدھیر کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس دوسرے طوفان نے اس کی زندگی کی چول ہلا دی ہو۔ اس کے ضمیر کے کوڑوں نے اس کی پیٹھ لہولہان کر دی ہو۔ ذلیل، کمینے، اوباش...کوڑے برستے رہے برستے رہے۔

ایک دن سدھیر کا کلاس فیلو دیواکر اس کے پاس آیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ دیر تک روتا رہا ہو۔ وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ پھر اس نے سدھیر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے اور کہنے لگا۔'' سدھیر، میرے دوست، تم ایک بڑے باپ کے بیٹے ہو، تمہارے لئے کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔ مگر یہ میری زندگی اور میری عزت کا سوال ہے۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

'' آخر ہوا کیا....تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' سدھیر نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہیں کیا کسی کو بھی پتا نہیں کہ میں اور سداما ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو جانا چاہتے ہیں مگر خود فراموشی کے ایک لمحے نے ہماری پاکیزہ اور معصوم محبت کے چہرے پر کالک مل دی ہے۔ سداما کے پیٹ میں میرا پاپ پل رہا ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ موجودہ حالت میں اس پاپ سے چھٹکارا حاصل کرنا ہمارے لئے کتنا ضروری ہے اور اسی لئے تمہارے آگے ہاتھ پھیلا رہا ہوں۔ سدھیر، ہمیں اس مصیبت سے تم ہی چھٹکارا دلا سکتے ہو، صرف تم ہی.....ڈاکٹر اس کے لئے پانچ ہزار روپئے مانگ رہی ہے۔''

سدھیر بت بنا کھڑا رہا۔ اس کے پاؤں لرزنے لگے جیسے ان میں اس کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ ہو۔ اسے لگا جیسے یہ تیسرا طوفان اسے ہوا میں اڑائے لئے جا رہا

ہو۔ حسین وجمیل، بنی سنوری، خوش لباس سداما سے دور، بہت دور....

''دیواکر!'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم سداما سے کہنا کہ اس کی عزت مجھے بہت عزیز ہے۔''

پھر اس نے جیب سے چیک بک نکال کر پانچ ہزار کا چیک کاٹ کر دیواکر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

☆☆☆☆☆

سطح سے نیچے

ممتاز گریجویشن کے بعد بالکل بیکار ہے۔

دوسال قبل اس نے گریجویشن کیا تھا اور تب سے اس نے برسرروزگار ہونے کے لئے مسلسل تگ ودو کی مگر ہر جگہ نو ویکینسی کسی چٹان کی طرح حائل رہی۔ اس کے والد نصیرالدین بھی تقریباً ایک سال قبل ہی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ وہ جب تک ٹاٹا کمپنی میں فورمین رہے، خاندان کافی خوشحال رہا۔ ہر طرح کے آرام وآسائش کے نقشے بنے۔ مگر اب تو آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ گزر بسر ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی رقم پر ہو رہی ہے۔

ممتاز میرا جگری دوست ہے جو ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے والد ایک مخلص، خلیق اور ملنسار انسان ہیں۔ اور جدید تہذیب کی اصطلاح میں ''دقیانوس'' بھی۔ میرے اور ان کے مراسم اچھے ہیں۔ بالکل ممتاز کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔

ایک دن ممتاز نے مجھے بتایا کہ ابّو جنرل اسٹور کھولنا چاہتے ہیں مگر رقم کی بہت کمی ہے.....تم کچھ مدد کرو تو کام بن سکتا ہے۔

کافی کدوکاوش کے بعد شہر کے مین مارکیٹ میں کرایہ کی دکان حاصل کی گئی۔ اور پھر سامان کا میل لگانے کے لئے نصیرالدین صاحب نے کیا کچھ نہیں کیا۔ آبائی مکان کا آدھا حصہ فروخت کیا، بیوی کے تقریباً سارے زیورات بیچے، مجھ سے بھی کچھ رقم بطور قرض لی۔ غرض سب کچھ کرنے کے بعد جنرل اسٹور کھولا گیا۔ جس دن دکان کا

افتتاح ہوااس سے ایک دن قبل دکان میں فاتحہ کرا کر شیرینی تقسیم کی گئی۔ بہر حال دکان کھل گئی۔

دن بھر دکان کی مصروفیت کے باعث ممتاز سے اب صرف جمعہ کے دن ملاقات ہوتی کیونکہ اس کی دکان اسی دن بندرہتی ہے۔ یا پھر میں ہی کبھی کبھار جب مارکیٹنگ کیلئے جاتا تو اس کی دکان پر چلا جاتا۔ ایسے موقع پر بس دکان کی بات نکل پڑتی۔

دکان کیسی چل رہی ہے....روزانہ کتنی آمدنی ہوتی ہے....گاہکوں کی کیا پوزیشن ہے...مال کہاں کہاں سے لاتے ہو....کون لاتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

کاؤنٹر پر ممتاز کے والد بیٹھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس بات کے شاکی رہتے ہیں کہ دکان ٹھیک نہیں چل رہی ہے....گاہک بہت کم آتے ہیں....حالانکہ دیگر دکانوں کی بہ نسبت چیزوں کا نرخ کم ہی ہے....

میں انہیں تسلی کے طور پر کہتا۔ ''گھبرانے کے کوئی بات نہیں چچا....نئی نئی دکان ہے....انشاءاللہ چل نکلے گی۔''

ایک جمعہ کے دن ممتاز سے میری ملاقات مسجد میں بعد نماز جمعہ ہوئی۔ علیک سلیک، خیر خیریت کے بعد وہی دکان کی بات چل نکلی۔ ممتاز بتانے لگا۔ ''اب خدا کا فضل ہے....دکان خوب زوروں پر ہے۔ شام کو اتنی بھیڑ ہوجاتی ہے کہ مجھ سے اور ابو سے سنبھالی نہیں جاتی....اس لئے اب شام کو چھوٹا بھائی بھی آجاتا ہے۔''

کہتے وقت اس کی آنکھوں میں ایک اداسی سی چھا گئی۔ کچھ لمحوں پہلے کا شاداں و فرحاں چہرہ غم کی آماجگاہ بن گیا۔ میں حیران ہوا کہ ایک ہفتہ میں کایا پلٹ ہوگئی۔ کہاں ایک ہفتہ قبل اس نے کہا تھا۔ ''ابو کا خیال ہے کہ اس دکان کو خالی کر کے کوئی دوسرا کاروبار کیا جائے۔'' اور اب وہی دکان اتنی چل رہی ہے کہ چھوٹے بھائی کو بھی رکھنا پڑ رہا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''ایسا کون سانسخہ ہاتھ لگ گیا بھی؟''

''کل آنا....دکان پر آ کر خود دیکھ لینا۔'' اس نے تھوڑا جھینپ کر کہا۔ اس کے لہجے میں بھرپور یاسیت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی اندرونی کرب میں مبتلا ہو۔

میں کشمکش میں پڑ گیا کہ آخر ایسی کون سی بات ہے کہ ممتاز مجھ سے بتانا نہیں چاہتا۔ آخر وہ اس سوال پر اتنا اداس کیوں ہوگیا؟ طرح طرح کے سوالات، قسم قسم کے خیالات ذہن کے پردے پر ابھرنے لگے۔ مگر میں نے زیادہ کریدا نہیں۔

دوسرے دن، سنیچر کی شام کو میں اس کی دکان پر پہنچا۔ ممتاز کے قول کے مطابق واقعی اتنی بھیڑ تھی کہ ایک گاہک کو سامان لے کر فارغ ہونے میں دس پندرہ منٹ تو لگ ہی رہے ہیں۔ میں خاموش کھڑا دکان کی گہما گہمی دیکھتا رہا۔ میں نے ممتاز کو مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ نصیرالدین صاحب کو دیکھا، وہ ہنس ہنس کر گاہکوں سے نمٹ رہے ہیں۔ مگر ممتاز کے چہرے پر اتنی بے رونقی ہے جیسے ابھی ابھی اپنے کسی رفیق کو دفن کر کے آیا ہو۔ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی ہے۔

اچانک میری نظر کیش کاؤنٹر پر پڑی اور پھر میرے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی معلوم ہوئی۔ کاؤنٹر پر جو شخصیت بیٹھی ہے، میں اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ او رتب مجھے ممتاز کی اداسی اور دکان پر لگی بھیڑ کی وجہ معلوم ہوگئی۔

کاؤنٹر پر ممتاز کی بیس سالہ کنواری بہن بیٹھی گاہکوں سے ہنس ہنس کر خندہ پیشانی کے ساتھ رقم وصول کر رہی تھی۔

میں سوچنے لگا انسان حصول زر کی خاطر اپنی سطح سے کتنا نیچے اتر آتا ہے ورنہ نصیرالدین صاحب جیسے خاندانی، شریف اور نیک طینت انسان سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

معمّہ

مہندر کے آفس سے آتے ہی تارا نے اس کے سینے میں منہ چھپا کر شرماتے ہوئے جب کہا کہ آپ تیسرے بچے کے باپ بننے والے ہیں تو وہ دنگ رہ گیا۔

''کیا؟....یہ کیسے؟'' اس نے سوچا۔

تارا کچھ دیر تک تو اس کے سینے سے لگی کھڑی رہی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ مہندر خاموش ہے تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور چونک پڑی کیونکہ وہ اسے خالی خالی نظروں سے گھور رہا تھا۔

''کیوں؟....کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟'' تارا نے تعجب سے پوچھا۔

''ن ن ن نہیں ڈیر....ایسی بات نہیں۔'' مہندر نے اس کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''پھر آپ اچانک اتنے اداس کیوں ہو گئے؟''

''اداس نہیں ہوں...میں سوچ رہا تھا کہ اتنی جلدی پھر...''

''بھگوان کی مرضی...'' تارا نے شرما کر کہا۔ ''آپ کپڑے بدلئے....میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

مہندر انتیس تیس برس کا ایک خوبرو جوان تھا۔ وہ ایک لڑکے اور ایک لڑکی کا باپ بن چکا تھا۔ فی الحال وہ ٹاٹا کمپنی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اصل میں اس تیسرے بچے کی آنے کی خبر سن کر اسے زبردست صدمہ پہنچا تھا کیونکہ وہ ایمرجنسی کے زمانے میں ہی اپنا آپریشن کرا چکا تھا اس لئے تیسرے بچے کی پیدائش کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس آپریشن کے متعلق اس نے تارا کو بے خبر رکھا تھا کیونکہ وہ نسبندی کی سخت مخالف تھی۔

پھر یہ بچہ؟ اس کے ذہن میں ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا۔ تو کیا تارا کسی دوسرے سے ....نہیں نہیں ....میری تارا ایسی نہیں ہے....میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں....پھر یہ بچہ؟....سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ہو گیا؟

تارا محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ چائے لا رہی تھی۔ اس لئے اس نے ذہن سے ان بے ہودہ خیالات کو جھٹک دیا۔ ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چائے پینے کے دوران وہ سوچ رہا تھا کہ کل جا کر وہ اپنے فیملی ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کرائے گا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ آپریشن ناکام ہو گیا ہو۔ بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔ وہ ہلکی ہلکی چسکیاں لے کر چائے پیتا رہا اور تارا گم صم کھڑی اسے محبت بھری نظروں سے تکے جا رہی تھی۔

دوسرے دن آفس جانے سے پہلے اپنے ڈاکٹر دوست رمیش کے پاس پہنچا اور ساری تفصیل بتا کر چیک اپ کی فرمائش کی۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ ''تمہارا خیال درست ہے مہندر....آپریشن کامیاب نہیں ہوا ہے....دراصل ایمرجنسی کے زمانے میں اس تحریک کا بڑا زور تھا۔ اس وقت بے شمار کیسز آتے تھے اور ڈاکٹر عجلت میں آپریشن کیا کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر لوگوں کا کیس خراب ہو گیا تھا....گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ بلکہ اچھا ہی ہوا کہ تمہارا کیس بھی خراب ہو گیا....اور اس بات کو ذہن سے نکال دو کہ کسی کے ساتھ تارا کے تعلقات ہوں گے۔''

مہندر نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔ اسے یہ جان کر بے خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی تارا بے داغ ہے اور اس کے خیالات بے بنیاد ثابت ہوئے۔

'' اچھا تو میں چلتا ہوں۔'' مہندر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ '' آفس بھی جانا

ہے.....بہت کم وقت رہ گیا ہے۔'' ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کر وہ عجلت میں ڈسپنسری سے باہر نکل آیا اور اپنی بائیک پر آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ آفس پہنچنے میں اسے دس منٹ لگ گئے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ گھر سے جو ضروری فائیل لے کر چلا تھا، وہ تو رمیش کے چیمبر میں ہی رہ گئی۔ عجلت میں فائیل کا دھیان ہی نہیں رہا۔ اب کیا ہوگا؟ بہت ضروری فائیل تھی۔ اس کے بغیر تو آفس میں آج کوئی کام ہی نہ ہوگا۔ آفس جانے کے بجائے وہ واپس ہو گیا۔

رمیش کے ڈسپنسری پہنچتے پہنچتے پھر دس پندرہ منٹ لگ گئے۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے ڈاکٹر رمیش کی زبان سے اپنا نام سن کر وہ اچانک رک گیا۔ رمیش کسی سے کہہ رہا تھا۔

''ابھی میرے پاس مہندر آیا تھا.....ایمرجنسی کے وقت اس نے نسبندی کرائی تھی، جو کامیاب تھی.....لیکن میں نے چیک اپ کر کے بتا دیا کہ آپریشن نامکمل رہ گیا تھا.....لیکن کب تک.....ہوسکتا ہے وہ ہسپتال کے کسی ڈاکٹر سے ملے.....اس لئے ہم لوگوں کو اب یہ کھیل بند کر دینا ہوگا.....''

مہندر نے ہضمی قفل کے سوارخ سے جھانک کر دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ خاموشی سے بغیر فائیل لئے الٹے پاؤں لوٹ گیا۔

دوسرے دن اس کی خودکشی اس کے اعزہ و اقارب کے لئے معمہ بنی ہوئی تھی۔

☆☆☆☆☆

حسین سراب

میں شدت سے محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لیتی ہے۔ میں جب بھی بلڈنگ کی بالکونی میں کھڑا ہوتا تو وہ کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی گزر جاتی ہے اور نیچے جانے والے زینے کی طرف پہنچتے پہنچتے ایک دو بار گھوم کر ضرور دیکھتی ہے۔ شروع شروع میں تو اسے اتفاق ہی سمجھا تھا مگر ایک دن آنکھیں چار ہونے پر وہ ایک ادائے ہوش ربائی سے مسکرا دی تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ اور پھر ان مسکراہٹوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا۔ میرے دل میں ایک عجیب سا جذبہ چٹکیاں لینے لگا۔ اس کی زلفوں سے اٹھتی مہک میں کھو جاتا چاہتا تھا۔ اس کے شفق گوں عارض کو بے اختیار چوم لینے کو دل چاہنے لگا۔ اس کے میدے جیسی رنگت والے جسم کو اپنی باہوں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ اس کے نینوں کی جھیل میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔

میں اکثر سوچتا کہ اس سے ملوں مگر جھجھکتا اور ڈرتا تھا کہ نہ جانے کیا ہو۔ ضروری نہیں کہ ان مسکراہٹوں کے پیچھے محبت کا جذبہ ہی پوشیدہ ہو۔

میں داور ری رولنگ مل میں انجینیئر ہوں۔ یتیم و یسیر، نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ اس لئے گھریلو قسم کی فکر و پریشانی سے آزاد تھا۔ شیام سندر مینسن کی تیسری منزل کے فلیٹ نمبر گیارہ میں رہائش تھی۔ ابھی کچھ دنوں قبل ہی وہ اسی منزل کے فلیٹ نمبر پندرہ میں کرایہ دار بن کر آئی تھی۔ جمشید پور ایسا شہر ہے جہاں پچھتر فیصد لوگ کرائے کے مکانوں میں ہی رہتے ہیں۔

مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے، کہاں کی رہنے والی ہے، اس کا آبائی وطن

کہاں ہے۔روزانہ صبح آٹھ بجے وہ کہاں جاتی ہے اور شام کے پانچ بجے کہاں سے لوٹتی ہے۔ذریعہ معاش کیا ہے؟ اور نہ میں نے کبھی جاننے کی کوشش ہی کی۔وہ اپنے فلیٹ میں تن تنہا رہتی تھی۔کسی مرد یا عورت کو بھی اس سے ملتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

ایک دن وہ خود ہی مجھ سے مل بیٹھی۔اتوار کا دن تھا۔تعارف کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام شبانہ ہے اور ایک چھوٹے سے فرم میں ٹائپسٹ ہے۔آبائی وطن بنارس ضلع ہے۔یہاں وہ اکیلی رہتی ہے۔شعروادب سے کافی شغف رکھتی ہے۔

اس نے مجھ سے کہا۔''میں آپ سے کئی دنوں سے ملنا چاہتی تھی کیونکہ یہاں میرا کوئی ساتھی نہیں ہے جس سے ادب اور شعروسخن پر گفتگو کی جا سکے۔میں ڈرتی تھی کہ کہیں آپ کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیں۔اور آپ تو جانتے ہی ہیں زمانے کی روش کو۔اگر تنہائی میں بھائی بہن بھی گفتگو کر رہے ہوں تو انجان لوگ شک وشبہہ کی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔''

اس دن کافی دیر تک اقبال و غالب کی شاعری پر، میر کی غزلوں اور خیام کی رباعیوں پر، پریم چند، منٹو اور کرشن چندر کے افسانوں پر، مختلف رسائل و جرائد کے معیار پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔اس دوران ہم دونوں کافی بے تکلف ہو چکے تھے۔ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہم دونوں برسوں سے ایک دوسرے کے شناسا رہے ہیں۔

پھر وہ چلی گئی۔اس کے جانے کے بعد میں اپنے دل میں چبھن سی محسوس کرنے لگا، ایک میٹھا میٹھا سا درد اور اداس کر دینے والی تنہائی کا احساس ہونے لگا۔مجھے لگا کہ میرے دل کے کسی گوشے میں اس نے جگہ بنالی ہے۔

پھر ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور بے تکلفی کی دیوار گرتی گئی۔ایک دن ہمت کر کے میں نے اپنی بے قراری کا اظہار کر دیا، جس کا اقرار اس نے نظریں جھکا کر شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کیا۔میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔اب اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا میں اپنا فرض تصور کرنے لگا۔ہماری اس محبت، میل جول اور اٹھنے بیٹھنے کا چرچا پوری بلڈنگ میں ہونے لگا مگر ہم لوگ ساری دنیا سے بے نیاز محبت کی کشتی میں سوار آگے بڑھتے رہے۔

ایک دن سویٹ مارٹ میں بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ میرا ایک پرانا ساتھی کریم میرے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

''آہا شعیب بھائی!.....کتنے دنوں کے بعد ہم ملے ہیں....شاید تین سال بعد ....اور سناؤ کیا حال ہے؟''

''اللہ کا کرم ہے....تم اپنی سناؤ، آجکل کیا مشغلہ ہے؟''

''ایک چھوٹے سے فرم میں اسٹینوگرافر ہو گیا ہوں۔''

''اچھا!.....بہت خوب....شادی وادی کر لی یا نہیں؟''

''ہوئی تو نہیں....اب ارادہ ہے....فرم میں کرنے والی ایک لڑکی ہے.... بات پکّی ہو گئی ہے۔''

''ارے تم تو چھپے رستم نکلے ....تم تو عشق وشق کے چکر سے کافی دور تھے، پھر یہ عشق کب سے کرنے لگے۔''

''پہلو میں حسن ہو تو عشق ہو ہی جاتا ہے۔''

''اچھا؟....خوب چل نکلے ہو....کیسی ہیں میری بھابھی اور کیا نام ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''نام تو شبنم ہے اور رہا خوبصورتی کا سوال تو تم میری میری جمالیاتی حس سے اچھی طرح واقف ہو۔'' کریم نے جواب دیا۔

''لگتا ہے زوردار ہاتھ مارا ہے تم نے....کسی دن دکھاؤ۔''

''لو دیکھو، میں ہر وقت اسے سینے سے لگائے رہتا ہوں۔'' کریم نے شرٹ کی اوپری جیب سے ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔تصویر پر نظر پڑتے ہی مجھے چکّر سا آنے لگا۔آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔میری حالت غیر ہونے لگی کیونکہ وہ

تصویر شبانہ کے سوا کسی اور کی نہ تھی۔ میں کبھی تصویر اور کبھی کریم کو دیکھنے لگا کہ کہیں وہ میرا مذاق تو نہیں اڑا رہا ہے۔ مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ میری بگڑتی ہوئی حالت کو اس نے بھانپ لیا۔ پوچھنے لگا۔ ''کیوں؟....کیسی ہے؟''

''ایں .... ہاں.....بہت خوبصورت ہے.....بلکہ حسین کہو۔'' میری آواز جگہ جگہ سے کریک ہوگئی۔

''کیا بات ہے شعیب؟....تم تصویر کو دیکھ کر کچھ....؟

''نہ....نہ....نہیں تو....''

''نہیں، ضرور کوئی بات ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''نہیں یار.....دراصل میں اس کی خوبصورتی میں کھو گیا تھا۔'' میں سے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ کیونکہ میں دوستی کے بیچ عداوت کے بیج نہیں بونا چاہتا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ گیا اور کریم سے ملاقات کا سلسلہ جاری رکھنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

میری اداسی اور غم وغصہ کی انتہا نہ رہی۔ طرح طرح کے وسوسے جنم لیتے رہے اور میں پیچ وتاب کھاتا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ آج شبانہ سے فیصلہ کرلوں گا کہ اس نے میری یا کریم کی زندگی سے اتنا سنگین مذاق کیوں کیا؟

فلیٹ پر پہنچا تو شام کے ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ شبانہ آ چکی ہوگی، یہ سوچ کر میں اس کے فلیٹ کی جانب بڑھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں دستک دینے ہی والا تھا کہ اندر سے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر ہضمی قفل کے سوراخ سے اندر جھانکا تو ایسا لگا جیسے بجلی کے ننگے تار پر ہاتھ پڑ گیا ہو۔ شبانہ کسی مرد کی باہوں میں بیٹھی مسکرا رہی تھی اور مرد کہہ رہا تھا۔'' دیکھو شکیلہ!.....مجھے اس کے ساتھ تمہارا اس طرح ملنا جلنا قطعی پسند نہیں۔''

''ارے مائی ڈیئر!.....شبانہ یا شبنم یا شکیلہ نے کہا۔'' تم سمجھتے کیوں نہیں....کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟.....دراصل وہ داورری رولنگ مل میں انجینیئر ہے.....دانہ بکھیر دیا ہے اب پنچھی بہت جلد جال میں پھنسنے والا ہے.....میں اپنے چھوٹے بھائی کو اس کے توسط سے اس مل میں جگہ دلانا چاہتی ہوں.....مجھ پر اعتماد کرو.....تمہارے علاوہ میں نے کسی کو نہیں چاہا۔'' شبانہ یا شبنم یا شکیلہ نے مرد کے ہونٹوں پر ایک بوسہ ثبت کرتے ہوئے کہا۔

مجھے متلی سی ہونے لگی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے اٹھا کر بلڈنگ سے نیچے پھینک دیا ہو۔ تو گویا اب تک میں ہی نہیں بلکہ میرا دوست کریم بھی اس حسین سراب کے پیچھے بھاگتا رہا اور شاید کمرے والا مرد بھی۔

☆☆☆☆☆

مظلوم

میرے مکان سے سات مکانات کے فاصلے پر آٹھویں مکان کے کھلے برآمدے میں جو ''لڑکی'' اپنے اکلوتے معصوم بچے کے ساتھ رات کی سردی میں چند پھٹے چیتھڑے کپڑوں اور بوسیدہ کمبل میں پڑی رہتی ہے، اس کا نام حمیدہ ہے۔ بابوجان کے مکان کا یہ برآمدہ حمیدہ کا گھر دوار اور اس کی کائنات ہے۔ اس برآمدے میں رہتے ہوئے اسے تقریباً دو مہینے ہوگئے۔ اس سے قبل وہ نہ جانے کہاں رہتی تھی۔ اور ''نہ جانے کہاں'' سے بھی قبل وہ حاجی سعید صاحب کے یہاں رہتی تھی۔ وہاں اس کا کام پانی بھرنا اور برتن مانجھنا تھا۔ اور یہ پیشہ تو جیسے وہ تقدیر کے ساتھ لے کر پیدا ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کے پیدا ہونے کے چند ماہ بعد ہی اس کا باپ کسی موذی مرض میں مبتلا ہوکر چل بسا۔ اور جب سات سال کی ہوئی تو ماں بھی دق کا مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے اسے اکیلی چھوڑ گئی۔ پڑوس کی ایک عورت زیبن بوا، جس سے حمیدہ کی ماں سے خوب نبھتی تھی، نے اپنے یہاں رکھ لیا۔ اور پھر وہیں سے اس نے پانی بھرنا، برتن مانجھنا شروع کیا تھا۔ گھر کے علاوہ محلے کے کئی گھروں میں بھی وہ پانی پہنچاتی تھی۔ اس کام کے عوض اسے جو محنتانہ ملتا تھا وہ زیبن بوا کو لا کر دے دیتی تھی۔

زیبن بوا نے اسے ماں کا پیار دیا۔ اس کے بے لوث پیار و خلوص نے حمیدہ کے اس احساس کو کم کر دیا کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔ مگر موت سے کس کو رستگاری ہے؟ حمیدہ نے عمر کے تیرہویں زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ زیبن بوا ایسی بیمار ہوئیں کہ ہفتہ بھر چارپائی پکڑنے کے بعد اللہ میاں سے جا ملیں۔ مگر جانے سے پہلے حمیدہ کا ہاتھ خیرن چوڑی والی کے ہاتھ میں دے دیا کہ یہ تمہارے ساتھ چوڑیوں کی ٹوکری ڈھوئے گی۔

خیرن نے اسے نعمت غیر مترقبہ کی طرح پایا۔ صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک چوڑیوں کی ٹوکری ڈھوتی اور باقی اوقات میں محلے میں پانی بھرتی اور برتن مانجھتی تھی۔

خیرن کے یہاں چار مہینے تو مزے سے گزرے مگر نہ جانے کیا ہوا کہ خیرن اور حمیدہ میں روزانہ چخ چخ ہونے لگی۔ کیونکہ حمیدہ عمر کی اس حد میں داخل ہوچکی تھی جہاں شعور میں پختگی، خیالات میں وسعت اور احساس میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اسے بھلے برے، اپنے پرائے کی تمیز ہوگئی تھی۔ اور اسی تمیز نے اس کے احساس کو جھنجھوڑ کر بتایا کہ خیرن پرائی ہے اور تمہاری حیثیت ایک لونڈی سے زیادہ نہیں ہے۔

آخر روزانہ کے جھگڑوں سے تنگ آ کر اس نے خیرن کو سات سلام کیا اور محلے کے حاجی سعید کی خاص گھریلو ملازمہ بن گئی۔ ان کے یہاں حمیدہ کو کسی بات کی تکلیف نہ تھی۔ کیونکہ حاجی صاحب ایک رحمدل، انسانیت نواز، مخلص اور صوم وصلوٰۃ کے پابند انسان تھے۔ اس کے بچپن سے اب تک کی دردبھری کہانی سے واقف تھے۔

حاجی سعید کے یہاں رہتے ہوئے اسے پانچ سال ہی ہوئے تھے کہ نہ جانے کیوں حاجی صاحب نے اسے نکال دیا۔ پھر پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گئی۔ اب جو ڈیڑھ برس بعد وہ پھر اسی بستی میں بابوجان کے یہاں پناہ لینے آئی تو اس کی گود میں تقریباً سال بھر کا ایک چھوٹا سا بیٹا بھی تھا۔

حاجی سعید کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ محلے کے ہی فرد تھے۔ اکثر ان سے مسجد میں ملاقات ہوجاتی۔

ایک دن میں نے ان سے حمیدہ کا ذکر چھیڑ کر ان سے پوچھ بیٹھا۔ ''حاجی صاحب، آخر آپ نے حمیدہ کو کیوں نکال دیا تھا؟''

کہنے لگے۔'' تنویر صاحب، میں عزت دار آدمی ہوں....حمیدہ نہ جانے کس کا گناہ لادلائی تھی....لوگ میرے بیٹے پر شک کر رہے تھے....آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میرے گھر دو دو جوان لڑکیاں ہیں....ان پر کیا اثر پڑتا....کل کو دنیا مجھے ہی مجرم ٹھہراتی۔''

تب مجھے معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کے گھر سے نکلنے کی کیا وجہ تھی۔اس کے بعد میرے دل میں خواہش جڑ پکڑنے لگی کہ حمیدہ سے پوچھوں کہ اس کے بچے کا باپ کون ہے؟ کون ہے جس نے ذلت بھری زندگی جینے پر مجبور کر دیا....آخر تم نے یہ گناہ کیوں کیا؟''

اسی غرض سے ایک دن میں نے اسے بلا کر دو ٹین پانی بھروایا اور پیسے دینے کے بعد کہا۔''حمیدہ، ایک بات پوچھوں....برا تو نہ مانو گی؟''

''پوچھئے....برا کیوں مانوں گی؟''اس نے حیرت سے کہا۔

''یہ تمہارا ہی بیٹا ہے نہ؟''

''ہاں....کیوں؟''

''اس کا باپ؟''

''باپ!''اس نے غم زدہ لہجے میں کہا۔''کیا کیجئے گا پوچھ کر بھیا....آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ بنا باپ کا بچہ ہے....پھر کاہے کو زخم پر نمک چھڑکتے ہیں....اس کے باپ آپ ہو سکتے ہیں....بابو جان ہو سکتے ہیں....''

''پھر بھی ...دیکھو مجھے اپنا ہمدرد سمجھو...ہوسکتا ہے تمہاری کہانی سن کر کوئی مدد کر سکوں۔''

''آپ کیا مدد کریں گے....آپ ہی جیسے انسان نے بھی مدد کا وعدہ کیا تھا جس نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے....اگر میں بتادوں تو کوئی یقین نہ کرے گا۔''

''کیوں؟''

''اگر میں سب سے یہ کہہ دوں کہ یہ بچہ آپ کا ہے تو کون یقین کرے گا؟''

''کیا مطلب؟....میں...؟''میں نے چونک کر کہا۔

''نہیں....آپ نہیں....میں ایک مثال دے رہی ہوں...کوئی یقین کرے گا؟''

''کوئی یقین کر سکتا ہے کوئی نہیں کر سکتا....مگر تم جس کے بارے میں کہو گی میں یقین کر لوں گا۔''

''تو ٹھیک ہے....میں ابھی آتی ہوں۔'' کہہ کر وہ پانی کا ٹین میرے ہی پاس چھوڑ کر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد آئی تو اس کی گود میں اس کا بچہ تھا۔

''لیجئے، دیکھئے....خوب غور سے دیکھئے۔''اس نے بچے کا چہرہ میری طرف کر کے کہا۔

''دیکھ تو رہا ہوں....مگر تم کہنا کیا چاہتی ہو۔'' کچھ نہ سمجھتے ہوئے میں نے پوچھا۔کیونکہ بچے کے چہرے پر مجھے کوئی خاص بات نہیں دکھائی دی۔عام سا چہرہ تھا جیسا کہ نوخیز بچوں کا ہوتا ہے۔

حمیدہ نے نہایت ہی نفرت بھرے لہجے میں کہا۔''کیا اس کی شکل حاجی سعید سے نہیں ملتی؟''

مجھے ایسا لگا جیسے حمیدہ نے میرے گال پر تھپڑ رسید کر دیا ہو۔

☆☆☆☆☆